حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی وادبی ماہ نامہ

سب رس

مارچ 2019ء
-/30 روپے
UGC'S Approved Urdu Journal-S.No.41103
ISSN-2278-6902

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے ملاقات کرتے ہوئے جناب کے۔ایشور، وزیر اقلیتی بہبود کو مبارکباد پیش کی،
جناب اے کے خاں، مشیر اقلیتی بہبود بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

پروفیسر بیگ احساس بہترین فکشن نگار کا جشن ادب ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے۔
فلم ساز مظفر علی، پروفیسر اشوک چکردھر، پروفیسر سید احتشام حسنین، (وائس چانسلر جامعہ ہمدرد)

بنیاد گزار سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۸۱ | شمارہ: ۳ | ماہ: مارچ | سال: ۲۰۱۹ء

مجلس ادارت

- سرپرست: راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر جی
- صدر: جناب زاہد علی خاں
- معتمد عمومی: پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور

مجلس مشاورت

- پروفیسر گوپی چند نارنگ
- جناب مجتبیٰ حسین
- پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

زرِ سالانہ

قیمت: -/30

- ہندوستان: **300**روپے
- پاکستان و بنگلہ دیش: 600روپے
- کتب خانوں سے: **400**روپے
- مغربی و عرب ممالک سے 60ڈالر یا 40پاؤنڈ

Phone: 040-23313311 | **Editor: 9849256723** | Fax: 040-23374448

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ: ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد 500 082. انڈیا

برقی پتہ: *E-mail: idarasabras@yahoo.in*

چیک یا ڈرافٹ: The Sabras Monthly, Hyderabad کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور نے طٰہٰ پرنٹ سسٹمس، لکڑی کا پل میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

کلونجی

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کررہی ہیں۔
آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔
آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا
مند پسند اور
آزمودہ نسخہ

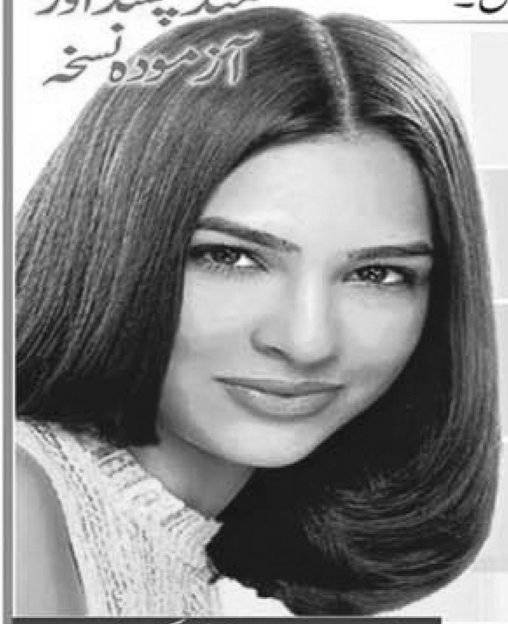

زم زم بہار ہیئر آئیل
• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفادور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم
• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم
• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاؤڈر
دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑا، منہ سے بدبو آنا وغیرہ، میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

• کلونجی تیل • کلونجی مساج آئیل • کلونجی پین بام • سفوف ظہیر • اکسیر معدہ
• سفوف اپسرا • سفوف دمہ • کلونجی شوگر پاؤڈر • کلونجی چیون پراش
• اکسیر جگر • معجون کلونجی • کلونجی شیمپو پاؤڈر • مرہم کافوری • روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان
جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

Mfg. Lic. No. 327/DU/98

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS
Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES
Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.
Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

اس شمارے میں

اداریہ

بابری مسجد۔رام مندر جنم بھومی مصالحت؟ — بیگ احساس — 6

مضامین

''غالب''نیوڈسکورس اور نقدِ''نارنگ'' — یوسف نون — 8

انارکلی حقیقت یا فسانہ — علی احمد فاطمی — 16

تلک الایام ۔۔۔نورالحسنین کا نیا ناول — اسود گوہر — 27

خراج عقیدت

آہ ۔۔۔میرے استاد محترم پروفیسر ظہورالدین! — مشتاق احمد وانی — 36

آپ بیتی

یادیں — راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرجی — 44

خودنوشت

ڈگر سے ہٹ کر — سعیدہ بانو احمد — 49

افسانے

''مجھے کیا بُرا تھا مرنا'' — رینو بہل — 55

گتھی — اسداللہ شریف — 65

شاعری

رحمٰن جامی، مسلم نواز، احسن رضوی، بی ۔ایس۔جین جوہر، — محمد شاہد پٹھان، مصداق اعظمی، سریواستو رند، مسعود جعفری، شبانہ عشرت — 69

مطالعہ

ہم زاد سے راست مکالمہ کرنے والا مجموعہ''خوابگینے'' — معین الدین عثمانی — 76

نقد ونظر

جوگندر پال کی افسانہ نگاری — ابوظہیر ربانی/جاں نثار معین — 79

جو وہ لکھیں گے جواب میں

خطوط — عارف خورشید، ناظم علی — 81

اداریہ

بابری مسجد۔رام مندر جنم بھومی مصالحت؟

بابری مسجد رام جنم بھومی کے سلسلے میں سپریم کورٹ نے ایک بار پھر مصالت اور فریقین کو تبادلۂ خیال کے ذریعہ عدالت کے باہر گفت وشنید کی صلاح دی ہے۔اس سے قبل وزیر اعظم چندر شیکھر راؤ کے عہد میں ایسی کوشش کی گئی تھی۔گفتگو میں ماہرین آثار قدیمہ اور مورخین کو بھی شامل کیا گیا تھا لیکن یہ کوشش بے فیض رہی۔بابری مسجد کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہر مرحلے پر نا انصافی اور جابرانہ کاروائی کے نشان ملتے ہیں۔تین گنبدوں والی یہ قدیم مسجد شہنشاہ بابر کے دور میں اودھ کے حاکم میر باقی اصفہانی نے 935ھ/1528ء میں تعمیر کروائی تھی۔مسجد میں تین صفیں تھیں اور ہر صف میں ایک سو بیس نمازی کھڑے ہو سکتے تھے۔صحن میں چار صفوں کی جگہ تھی اس طرح بیک وقت آٹھ سو مصلی نماز ادا کر سکتے تھے۔ابتدائے تعمیر سے اس مسجد میں نماز پنجگانہ اور جمعہ کی نماز ادا کی جاتی رہی۔بابری مسجد کے مصارف کے لیے عہد مغلیہ میں ساٹھ روپے سالانہ شاہی خزانے سے ملتے تھے۔نوابان اودھ کے دور میں تین سو دو روپے تین آنے چھ پائی مقرر کیے گئے جو برطانوی اقتدار میں بھی بحال رہے ہے۔مسجد کی حیثیت سے مسلمانوں کی عبادت گاہ رہی اور وہ عبادت ادا کرتے رہے۔

انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' پالیسی کے تحت ایک بدھسٹ نجومی کو سکھا پڑھا کر ''جنم استھان'' اور ''سیتا کی رسوئی'' کے مقام کی نشاندہی بابری مسجد سے متصل احاطہ کے اندر کی گئی۔پھر ہندوؤں کو اکسایا گیا کہ وہ ان پوتر استھانوں کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔نقی علی خاں جو نواب واجد علی کا خسر اور وزیر تھا اس سازش میں شامل ہو گیا۔اور نواب واجد علی شاہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ بابری مسجد کے باہر مگر اس کے احاطے کے اندر جنم استھان اور سیتا کی رسوئی کی جگہ دے دی جائے۔چناں چہ مسجد کے بالمقابل احاطہ مسجد کی دیوار سے متصل داہنی سمت ''سیتا کی رسوئی'' کے لیے اور صحن مسجد سے باہر بائیں جانب پورب کی طرف جنم استھان کے نام سے 21 فٹ لمبی اور 17 فٹ چوڑی جگہ دے دی گئی جس پر اسی وقت سے پوجا پاٹ کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا۔حالاں کہ قلب شہر میں برسہا برس سے جنم استھان کا مندر موجود تھا۔اسی منحوس تاریخ سے ایودھیا میں مذہبی کشمکش شروع ہو گئی اور یہاں کے ہندو مسلمان آپس میں دست بہ گریباں ہو گئے۔

1948-49ء میں جب کہ ملک فرقہ وارانہ تشدد کی آگ میں جل رہا تھا، 22،23 دسمبر 1949ء کی درمیانی رات میں ہنومان گڑھی کے مہنت ''ابھے رام داس'' نے اپنے کچھ چیلوں کے ساتھ مسجد میں گھس کر عین محراب کے اندر ایک مورتی رکھ دی۔اس اقدام کے خلاف کانسٹیبل ماتو پرشاد جو ڈیوٹی پر تھے رپورٹ درج کروائی کہ ''ابھے رام داس، سدرشن داس اور پچاس ساٹھ نامعلوم لوگوں نے

مسجد کے اندر مورتی استھاپت (نصب) کر کے مسجد کو ناپاک کر دیا۔ جس سے نقص امن کا خطرہ ہے۔

رپورٹ کے مطابق مورتی کو مسجد سے نکال کر اس مسئلہ کو ختم کر دیا جا سکتا تھا لیکن فیض آباد کے سٹی مجسٹریٹ نے دفعہ 145 کے تحت مسجد اور اس سے ملحق گنج شہیداں کو قرق کر کے مقفل کر دیا۔ نیز فریقین کے نام نوٹس جاری کیا گیا کہ اپنے اپنے دعوے پر ثبوت پیش کریں۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے اس سنگین معاملے کی طرف پنڈت جواہر لعل نہرو کو توجہ دلائی۔ انھوں نے گوند ولبھ پنت، وزیر اعلیٰ یوپی کو لکھا۔ لیکن کوئی مثبت کارروائی نہیں کی گئی۔ سیکولرزم پر مذہبی جانب داری حاوی رہی۔

19/جنوری 1950ء کو عدالت نے ایک حکم امتناعی کے ذریعہ ہندو مسلمان دونوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔ 13/مارچ 1951ء میں عدالت نے پجاری کو مسجد کے اندر جا کر پوجا اور بھوگ کرنے کی اجازت دے دی۔ 1961ء میں رام چندر کی جانب سے ایک نرموہی اکھاڑہ کی طرف سے ایک مقدمہ دائر کیا گیا۔ جواب میں جمیعۃ العلما ہند اور یوپی سنی سنٹرل وقت بورڈ کی جانب سے مقدمات قایم کیے گئے۔ تقریباً 35 برس تک یہ مقدمات عدالت میں معطل پڑے رہے۔ 25/جنوری 1986ء کو ایک غیر متعلق شخص رمیش پانڈے نے عدالت میں پوجا پاٹ کی اجازت کی درخواست گذاری۔ یکم/فروری 1986 کو پونے بارہ بجے ڈسٹرکٹ جج نے یک طرفہ فیصلہ سنا دیا اور پوجا پاٹ کی عام اجازت دے دی۔ اس سے عام ہندوؤں کے حوصلے بلند ہوئے اور شیلا نیاس کی تحریک چلائی گئی۔

نئی نسل نے بابری مسجد کے انہدام کی کارروائی اپنے آنکھوں سے دیکھی ہے۔ 30/ستمبر 2010ء کو بابری مسجد اور رام جنم استھان حق ملکیت کا مقدمہ کا فیصلہ 60 برس کے طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد سنایا گیا۔ اس فیصلے میں آستھاؤں اور عقیدتوں پر زور دیا گیا تھا۔ اس فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا کیوں کہ ملک استھاؤں اور عقیدوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ قانون وانصاف کے تحت چلتا ہے۔ اب عدالت اسے گفت شنید کے ذریعہ حل کرنے پر زور دے رہی ہے۔ سپریم کورٹ نے ایک مصالحتی ٹیم بنائی ہے۔ ایک سابق جج، ایک سابق وکیل اور ایک مذہبی پیشوا اس ٹیم میں شامل ہیں۔ مذہبی پیشوا کی شمولیت پر سب سے زیادہ سوال قایم کیے جا رہے ہیں۔ مصالحت کی کوششوں کو اخبار، ٹی وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ پر پیش کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ آخر ایسا کیوں کیا گیا؟ بابری مسجد کے سلسلے میں مسلمانوں نے ہمیشہ عدالت پر اعتماد کا اظہار کیا۔ پھر عدالت سے باہر مصالحت کیوں کی جا رہی ہے۔ پہلے ہی اس تنازعہ میں لاکھوں بے گناہوں کا خون بہا ہے۔ اس قضیئے کو نیک نیتی سے ختم کرنا چاہیے۔

لوک سبھا کے انتخابات کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ بہتر یہی ہوگا اس طرح کی مصالحت انتخابات کے بعد شروع کی جائے۔ ملک میں ایک فرقہ پرست جماعت اپنی جیت کے لیے کسی بھی حد کو پار کر سکتی ہے۔ اس لیے اس گفت وشنید کو ملتوی رکھا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ورنہ اس مسئلے سے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے اور عوام کے جذبات بھڑکائے جا سکتے ہیں۔

بیگ احساس

یوسف نون

''غالب'' نیوڈسکورس اور نقدِ ''نارنگ''

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

مانندِ مے کدہ، بلا تفریق فیضِ غالب جاری و ساری ہے۔اس مے خانہ سے فیض یاب ہونے کے لیے دِل گداختہ، شرط اوّلیں قرار پاتا ہے۔ ہر ساقی (غالب شناس) نے اپنے ساغر و پیمانا کے مطابق جدا جدا رنگ ولطف اور نشے سے لبریز بادہ ناب کشید کر کے اپنی اور اپنے تشنہِ بادہ خواروں کی سقائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ سب کا منبع ومحور تو ایک ہے مگر اس مصدر سے خام مواد کا حصول، ترکیب، عمل کشید اور اس کے بعد مینا و ساغر پیمانہ اور پیش کش کا انداز ہر ایک کا منفرد اور جدا جدا ہیں۔ یہ ایسا مے کدہ ہے، جس میں جو بادہ خوار بھی آتا ہے لبریز ہی لوٹتا ہے۔ یہ شرابیں جب شرابوں سے ملتی ہیں تو ان کا اثر دو چند آتشہ ہو جاتا ہے۔عرصہ دراز تک صہبائے غالب کے مے خوار ساغر جم کو گدگداتے رہے اور مے عجم کے نشے میں دیوانا وار جھومتے نظر آئے۔مگر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سب سے پہلے ہندوستان کی مٹی سے بنے جام سفال اور دیسی شراب غالب سے نہ صرف خود لطف اُٹھاتے رہے بلکہ اپنے مے خواروں کو بھی اس سے سرشار کیا ہے۔ غالب نے خود ہی کہہ دیا تھا۔

جامِ جام سے میرا جام سفال اچھا ہے

غالب برانڈ کی ہر دَور میں مانگ رہی ہے۔ غالب شناسی کا آغاز غالب کی زندگی سے ہی ہو چکا تھا۔صہبائے غالب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنا اثر دو چند کرتی گئی شرابِ کہن کی مانند آج کی تنقیدِ غالب پہلے سے زیادہ ثروت مند ہے۔حالی نے غالب شناسی کی ایسی بابرکت اینٹ رکھی کہ آج ساغر جم سے بھی کہیں بڑا جام سفال کھڑا کر دیا ہے۔ غالب اُردو ادب کی وہ جامع صفات اور عظیم ہستی ہیں جن پر ہر نوع کا تنقیدی و تحقیقی، تعبیری و تشریحی اور سندی و غیر سندی کام اس قدر بہتات سے ہوا کہ اَب غالب کا نیا پہلا تلاش کرنا، یا نئی تعبیر پیش کرنا بظاہر ناممکنات میں سے لگتا ہے، ایسا ناممکن نہ سہی، پر اَب آسان بھی نہیں۔ کئی ناقدین خام خیالی کا شکار رہے، اپنے کام کو حرفِ آخر جان کر مزید کچھ نہ کہے جا سکنے کی حد ڈال دی، مگر غالب ایسے شخص اور شاعر ہیں جو تیقنات اور تعینات کی دنیا سے ورا ہیں۔ان کے ہاں امکانات کی دنیا اس قدر وسیع ہے کہ اس مصرعے کے مصداق:

ع ''ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں''

غالب شناسی کا عمل نہ ختم ہونے والا اور جاری و ساری ہے۔ غالب کی حمایت اور مخالفت میں ہر دَور میں لکھا گیا اور لکھا جاتا رہے گا۔اب غالب ہماری فکری اور معاشرتی زندگی کا حصہ بن گئے ہیں۔ غالب ہماری زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی کرتے ہیں۔ ہر غالب شناس نے اپنے ذوق، مزاج، حالات اور صلاحیتوں کے مطابق غالب سے استفادہ کیا ہے اور غالب شناسی کی کوئی نہ کوئی نئی جہت جگائی ہے۔

غالب مغل زادہ تھے اور مغلوں میں غالب سے بڑھ کر کوئی بڑا شخص پیدا نہ ہوا۔ وہ کسی خاص وقت یا دَور کے شاعر ہرگز نہیں بلکہ ان کی شاعری نے ہر وقت اور زمانے کا پورے طور پر ساتھ نبھایا ہے۔ ان کی آفاقیت انہیں اُردو یا فارسی دنیا تک محدود نہیں ہونے دیتی بلکہ وہ بین الاقوامی طور پر بھی دِلوں کی آواز بنتے ہیں۔ غالب کو اپنے زمانے میں ہی پورے ہندوستان میں شہرت نصیب ہوئی اور ان کی شاعری کے نمونے انگلستان تک پہنچے۔آج

مشرق ومغرب میں ہر جگہ غالب شناس موجود ہیں۔ مکان کی طرح غالب زمان کی حدود میں بھی نہیں سماتے۔ وہ صرف انیسویں یا بیسویں صدی کے شاعر ہی نہیں بلکہ اکیسویں صدی کے جدید اور مابعد جدید ذہن سے بھی ان کی پوری فکری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ غالب دراصل انسانیت کے شاعر ہیں، اس لیے وہ فکری طور پر ہر طبقے، مذہب، خطے اور ہر دَور کے انسان سے میل کھاتے ہیں۔ اس طرح غالب ہمیں زمان و مکان کی قید سے ورا نظر آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہر سماجی، ادبی فکر یتحلقوں سے تعلق رکھنے والوں نے اپنا سا غالب پایا ہے۔ جو ان کے مقررہ سانچوں پر پورا بھی اُترتا ہے اور اُن سے ورا بھی ہے۔ غالب کے یاں اس قدر وسعت اور آفاقیت ہے کہ

ع ''جو سنتا ہے اس کی داستاں معلوم ہوتی ہے''

کلاسیکیت پسندوں، رجعت پسندوں، رومانیت پسندوں، ترقی پسندوں، جدیدیت و مابعد جدیدیت کے پرستاروں میں سے ہر ایک کا اپنا جُدا جُدا غالب ہے۔ غالب کی پیش کردہ ہر تعبیر بیک وقت درست، اہم، مکمل اور نا تمام بھی ہے۔ جو مزید توضیح کی متقاضی اور تعبیر نو کا پیش خیمہ ہے۔

انیسویں صدی غالب شناسی کی ابتدا ہے۔ ایسی خوش قسمتی کہ آغاز ہی میں غالب شناسی کو حالی جیسا نقاد میسر آیا۔ آج تک کوئی بھی غالب ڈس کورس حالی سے اتفاق و اختلاف کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ حالی انیسویں صدی کے آخر میں غالب شناسی کا روشن چراغ ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بیسویں صدی کا سورج نمودار ہوتے ہی بجنوری اس روایت کو تقویت دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ خلیفہ عبدالحکیم، شیخ اکرام، خورشید الاسلام وغیرہ ایسے بابرکت نقادوں نے غالب ڈس کورس میں گراں قدر اضافے کیے اور اسے نقطہ عروج تک پہنچایا۔ اس طرح بیسویں صدی کو ''غالب شناسی'' میں عروج کی صدی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس صدی میں غالب کی صد سالہ وفات، دو صد سالہ پیدائش بھی منائی گئی۔ تقاریب ہوئیں، کتب تصنیف ہوئیں، ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ میں مصوری، ڈراما اور فلم وغیرہ میں بھی غالب نظر آنے لگے۔ شاید غالب کا کوئی ایسا پہلو ہو جو نہاں رہ گیا ہو، ہنوز تشنگی باقی ہے۔ عروج کے بعد نزول کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، مگر اکیسویں صدی جس میں غالبیات کے میدان میں خاص فتوحات کی توقع نہ تھی، اس سب کے برعکس اکیسویں صدی غالب شناسی کے باب میں مہا عروج کی صدی ثابت ہو رہی ہے۔ اکیسویں صدی کو از سرِ نو دریافت کی صدی قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ غالب شناسی کے حوالے سے اکیسویں صدی کو یہ شرف عہد ساز نقاد، محقق و ماہر لسانیات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بخشا ہے۔ گوپی چند نارنگ غالب کے وہ واحد نقاد ہیں جنھوں نے غالب کو اپنی مٹی (ہندوستان) کا اعتبار عطا کیا ہے۔ اُنھوں نے ہندوستانی زمین سے پھوٹنے والے فکر و فلسفے میں غالب کے لاشعور کی جڑیں تلاش کی ہیں۔ یقیناً یہ بہت بڑا کارنامہ ہے جس طرح انیسویں صدی کے حالی، بیسویں صدی کے بجنوری اور شیخ اکرام غالب شناسی کے بڑے حوالے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اسی طرح نا صرف اکیسویں صدی بلکہ دو صدیوں پر پھیلی غالب شناسی کا سب سے بڑا حوالہ گوپی چند نارنگ ہی بن جاتے ہیں، جنھوں نے نہ صرف غالب شناسی کے نئے گوشے تلاش کیے بلکہ آئندہ کے لیے غالب شناسی کو نئی راہ پہ بھی ڈالا ہے۔

☆ ☆ ☆

دیگر نقادوں سے برعکس ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی انفرادیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ گوپی چند نارنگ ایک غیر مشروط نقاد ہیں، وہ ادب کو معتقدات اور تصورات میں مقید نہیں کرتے۔ وہ ادب کو ایک سچائی مانتے ہیں، ان کی تنقید کا سفر سچائی کی تلاش کا سفر ہے۔ گوپی چند نارنگ کی تنقیدی فکر مسلسل تغیر پذیر ہے۔ اُنھوں نے اپنی

عملی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز بحیثیت محقق کے کیا۔ ان کی پہلی کتاب ''ہندوستانی قصوں سے ماخذ اُردو مثنویاں'' ہے، تحقیق کے بعد ان کا اگلا میدان لسانیات کا ہے۔ لسانیات کے میدان میں بھی گراں قدر کارنامے سرانجام دے چکے ہیں۔ وہ ماہرِ اسلوبیات بھی ہیں، اُردو میں مسعود حسین خاں کے بعد ''اسلوب اور اُسلوبیات'' کے میدان میں خاطر خواہ کام کر چکے ہیں۔ اُسلوبیات کے راستے سے تنقید میں آتے ہیں۔ وہ اقبال شناسی، میر شناسی کے ساتھ ساتھ انیس و دبیر کو اپنے احاطہ موضوع میں لا چکے ہیں۔ وہ بطور ماہر شعریات اور تھیورسٹ کے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے اُردو دنیا کو ساختیات، پس ساختیات ایسے نئے موضوعات سے نہ صرف روشناس کرایا بلکہ ان موضوعات کا چلن بھی عام کیا۔ اس کے علاوہ جدیدیت، مابعد جدیدیت کے فکری و نظری مباحث کے ساتھ ساتھ، عملی طور پر بھی اُن کا خاصا وقیع کام ہے۔ وہ جہاں مغرب سے روشنی لیتے ہیں وہیں مشرقیت بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ نارنگ کی فکری جڑیں ہندوستان کی سرزمین میں پیوست ہیں۔ وہ خواہ ساختیات سے نبرد آزما ہوں یا اُردو غزل کے ہندوستانی ذہن اور تہذیب سے یا پھر ہندوستان کی تحریک آزادی کے بعد کی شاعری کا مطالعہ کر رہے ہوں، وہ اپنی زمین سے اپنا رشتہ جوڑے رکھتے ہیں۔ فکشن ہو یا شاعری، کلاسیکی ادب ہو یا معاصر ادب ان کی نگاہ سب سے یکساں طور پر استفادہ کرتی ہے۔ ان کے ہاں مقامیت کا عنصر نمایاں ہے، جس میں وہ مقامی فکر و فلسفہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ مقامی فکر و فلسفہ سے اپنے تھیسس یا مؤقف کو تقویت دیتے ہوئے یا یہ ثبوت تک پہنچاتے ہیں، جو ان کی فکری انفرادیت پر دال ہے۔ اب وہ ماہر غالب شناس کے طور پر جب سامنے آتے ہیں تو ان کی انفرادیت سبک ہندی، بیدل، عرفان دانش ہند، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات، مارکسی جدلیات، بودھی جدلیات، متصوفانہ جدلیات اور دریدائی ٹریس کی روشنی مطالعات غالب سے واضح ہوتی ہے۔ غالب کے حوالے سے ان کے ہندوستانی ذہن، اور ہندوستانی فکر و فلسفہ کی تلاش اتنے منظّم اور منضبط انداز میں پہلی بار پیش کی گئی ہے۔ وہ غالب کو کسی صوفی، صافی کی بجائے ان کی شعریات کو ارضیت اساس ثابت کرتے ہیں۔

گوپی چند نارنگ کی تصنیف ''غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات'' اپنے موضوع اور انداز کے اعتبار سے تنقید غالب کی ایک منفرد کتاب ہے کیونکہ اس سے پہلے غالب کی فکر کو اس تناظر میں نہ ہی دیکھا اور پرکھا گیا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، غالب کی فکر کو عجمیت کی بجائے ہندوستانیت سے ملاتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی طویل فکری کاوش کا نتیجہ ہے کہ وہ زمانہ طالب علمی سے ہی 'انڈالوجی' سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب پر اور ان کے درمیان آپسی تعلقات کی تلاش کا کام طویل عرصہ سے کر رہے تھے۔ اُنہوں نے غالب کی فکر اور ان کے ہاں موجود ڈکشن میں بھی دانش ہند، ویدانتی فکر اور بودھی فکر شونیتا و جدلیاتی وضع کے غالب آثار تلاش کیے ہیں۔ قدیم دانش ہند کے ساتھ ساتھ غالب کو مابعد جدید ذہن قرار دیا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے اپنے تھیسس کی بنیاد حالی سے رکھی، مزید بجنوری کے قول محال کو بنیاد بنا کر غالب کی فکری جڑیں عجمیت یا فارسی شاعری کی روایت کی بجائے، غالب کی فکری اساس سبک ہندی اور بیدل میں تلاش کرتے ہیں۔ یہ انداز مطالعہ نیا تو نہیں، مگر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی خاص بات یہ ہے کہ سبک ہندی اور بیدل کے مطالعے سے کئی نئے پہلو تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ غالب کے ہاں موجود سبک ہندی کے اثرات اور بیدل سے فکری مماثلت سے غالب کی فکر کو ہندوستانی الاصل ثابت کرتے ہیں۔ اس کتاب کا خاص پہلو دانش ہند، ویدانتی اور بودھی فکر، شونیتا اور جدلیاتی وضع ہے یہ فکرِ غالب کا ایک الگ نیا اچھوتا اور منفرد پہلو ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنے تھیسس

کا دفاع کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں، وہ غالب کی عجمیت اور ماورائیت کے فکری نظریے کی ردِ تشکیل کرتے ہوئے انہیں ہندوستانیت اور ارضیت اساس پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنے اس تھیسس کی تائید اور وضاحت کے لیے غالب کے اُردو کلام کو بنیاد بناتے ہوئے اس کی تعبیر و تفہیم پیش کرتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ بموجب ضرورت فارسی کلام سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ فارسی متن کے ضمن میں جو خاص بات ہے وہ یہ کہ غالب اور دیگر فارسی شعرا کے کلام کے متن کے نیچے قوسین میں لفظی ترجمہ کی بجائے مفہوم یا تعبیر دی ہے تاکہ وہ قاری جو فارسی زبان سے واقفیت نہیں رکھتا، ان اشعار کی تفہیم حاصل کر سکے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے غالب کے منسوخ اُردو کلام ''روایت اوّل نسخہ امروہہ''، روایت دوم ''نسخہ حمیدیہ اور غالب کے اُردو متداول دیوان'' کا وسیع تر مطالعہ پیش کیا ہے اور ایسے اشعار کی کثرت سے نشاندہی کی ہے جن میں غالب نے جدلیاتی افتاد سے شونیتا اور جدلیاتی نفی، نفی در نفی سے معنی در معنی کی مینا کاری کی ہے۔ گوپی چند نارنگ کی ان تعبیرات کا موازنہ اگر حالی و بجنوری سے لے کر آج کے غالب شناسوں کی پیش کردہ تعبیرات سے کیا جائے تو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور دیگر غالب شناسوں کی تعبیرات میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ گوپی چند نارنگ جس نکتہ سنجی، باریکی اور گہرائی کو پا سکے ہیں دوسرا کوئی بھی غالب شناس یہاں تک پہنچنا تو درکنار غالب کے ہاں موجود اس غالب پہلو کے بارے میں سوچ بھی نہ سکا۔ گوپی چند نارنگ اس سارے عمل کو غالب کی نئی شرح پیش کرنے کی بجائے تعبیر نو قرار دیتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ اپنے سے متقدم غالب شناسوں سے بھی استفادہ ضرور کرتے ہیں۔ اس استفادہ میں اختلاف و اتفاق دونوں کی گنجائش رکھتے ہیں۔

''خاطر نشاں رہے کہ ہمارا مقصد غالب کی نئی شرح فراہم کرنا نہیں ہے۔ یہ شارحین کا کام ہے۔ ہم جملہ شارحین و ماہرین کے کام کی قدر کرتے ہیں لیکن ہمارا سفر الگ نوعیت کا ہے اور ہماری سعی و جستجو کی جہت دوسری ہے۔ یہ کسی رد یا تخالف میں بھی نہیں ہے بلکہ اس اعتبار سے ہم جملہ ماہرین و شارحین کے ممنون ہیں کہ ان کے کارناموں اور دقیقہ سنجیوں کی بدولت غالب ڈسکورس یہاں تک نہ پہنچا ہوتا جہاں وہ اس وقت ہے تو ہمارے لیے اس دقت طلب راہ میں قدم اُٹھانا آسان نہ تھا۔ تاہم ماہرین نے غالب کے بارے میں سب گتھیوں کو حل کر لیا ہو ایسا بھی نہیں ہے۔ غالب کے تخلیقی سفر، ذہن و زندگی اور فکر و فن کے بہت گوشے ایسے ہیں اور بہت پیچیدہ سوال اس نوعیت کے ہیں کہ ان کے جواب ہنوز فراہم نہیں کیے جا سکے، غالب کے گنجینہ معنی کے طلسم کے بھی کئی در ایسے ہیں جو ہنوز وا نہیں ہوئے۔ متن کی قوت زمان کے محور پر قاری کے تفاعل کے ساتھ مل کر معنی پروری کر رہی ہے اور کرتی رہے گی۔ یوں بھی کوئی تعبیر آخری تعبیر نہیں ہو سکتی نہ ہی کوئی تعبیر آئندہ تعبیروں کے امکانات ختم کر سکتی ہے، پھر غالب کا تو معاملہ ہی ایسا ہے کہ ہر تعبیر خواہ وہ کتنی ہی مکمل نظر آئے تشنہ تکمیل رہتی ہے۔ متن کو دیکھنے اور متن میں داخل ہونے کے کئی پیرائے ہیں۔ ایک پیرایہ ایک تجسس ہمارا بھی ہے کہ غالب کی افتاد ذہنی، یا سائیکی میں، یا لاشعوری تخلیقی نہاد میں وہ کیا چیز ہے جو ہر

سامنے کے تصور کو نکارتی یا رد کر دیتی ہے اور روزمرہ کی معمولہ حقیقت میں طرفگی کا کوئی نہ کوئی نیا پہلو نکال لیتی ہے۔'' [۱]

گوپی چند نارنگ کا سارا سفر انہی امکانات کی تلاش کا سفر ہے۔ اس سفر کے بعد گوپی چند نارنگ غالب کا فکری رشتہ مقامی فلسفے: دانش ہند، بودھی فکر شونیتا اور جدلیاتی نفی میں دریافت کر پائے ہیں۔ ان کے اس سفر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ غالب کی فکر کے ڈانڈے آج کی مابعد جدید فکر سے ملانے میں کامیاب ہوئے ہیں جبکہ سبک ہندی اور بیدل سے فکری ہم آہنگی کے رشتے کا کھوج کئی غالب شناس پہلے سے ہی لگا چکے تھے۔ اسے بھی از سر نو دریافت کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیئر، گوپی چند نارنگ کی اس تصنیف پر ان الفاظ میں رائے دیتے ہیں:

''نارنگ صاحب کی غالب پر یہ کتاب، اُردو میں غالبیات کی تاریخ کا ایک واقعہ ہے اور غالب کی ایک نئی تعبیر ہے، ایک ایسی تعبیر جو غالب کے تعلق سے صدیوں کے ثقافتی عمل کی کنہ تک ہمیں لے جاتی ہے۔ آپ اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے خود کو تبدیل ہوتے محسوس کرتے ہیں، یہ خاموشی سے مگر ایک غلبہ آفریں قوت کے ساتھ آپ کے ذہن اور حواس پر بہ یک وقت اثر انداز ہوتی ہے۔ آپ کے بہت سے تیقنات کو برہم کرتی، کچھ دیر کے لیے آپ کو ایک عجب ذہنی بحران میں مبتلا کرتی، سوالات سے آپ کے بنے بنائے ذہنی سانچوں پر ضرب لگاتی اور پھر ان سوالات کے ممکنہ جوابات کی طرف آپ کی رہنمائی کر کے آپ کے ذہن میں غالب فہمی کے نئے تصورات بھی اُبھارتی ہے۔ کتاب کا استدلال اور اُسلوب دونوں اپنے قاری کو گرفت میں لیتے ہیں۔ یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ فلسفہ و جمال کی آمیزش سے ترکیب پانے والی غیر معمولی بات!'' [۲]

دیگر غالب شناسوں نے کلامِ غالب میں سے طرفگی خیال، ندرت و جدتِ مضامین، مضمون آفرینی، خیال بندی اور معنی آفرینی ایسے خواص کا کھوج لگایا ہے۔ انہیں بڑے اہتمام و فخر سے پیش کیا ہے، مگر نارنگ وہ کام کرتے ہیں جو اور کوئی نہ کر سکا۔ وہ یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ ساری خصوصیات تشکیل شعر میں قائم کیسے ہوئیں؟ تراکیب، اسناد، تشبیہ و استعارہ، کنایہ و تمثیل اور شوخی و ظرافت، ایسے تمام پہلو سامنے اور ہیئت کے لوازم ہیں۔ یہ ایسے لوازم ہیں جو متقدمین اور معاصرینِ غالب سب میں سانجھے ہیں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی صورت میں مِل جاتے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہ لوازم غالب کے ہاں کیسے؟ اور کہاں سے آتے ہیں؟ حالی نے غالب کے ہاں پائی جانے والی تناسبِ لفظی، طرفگی خیال اور جدت مضامین پر زور دیا ہے۔ نارنگ نے پہلے ہی باب میں اپنا تھیسس قائم کیا ہے کہ یہ خصوصیات تو بجا ہیں، مگر یہ لوازم غالب کی شاعری میں کیسے اور کہاں سے آئے ہیں۔ ان کے پیچھے غالب کی شعری زبان کی تہ میں کون سا فکر و فلسفہ ہے، جس سبب یہ معنیاتی نظام کارفرما ہے، جو غالب کی تخلیق کے دوران، شعوری یا لاشعوری طور پر اثر انداز ہوا، اور وہ جو غالب کی افتادِ ذہنی کا لازمی حصہ ہے۔ نارنگ اس قفل ابجد کا سراغ لگاتے ہیں۔ نارنگ اس قفل ابجد کو دریافت کرنے کے بعد اسے ڈی کوڈ کرتے ہیں کہ کون سا فلسفہ ایسا ہے جو غالب کے شعور اور لاشعور، سرشت و نہاد پر اثر انداز ہو کر غالب کے ہاں متناسب لفظی، طرفگی خیال، معنی آفرینی، مضمون

بندی، جدلیاتی حرکیات کا ایک نظام وضع کرتا ہے۔اس نظام وفکر کی جڑیں زیرِ زمین کس قدر گہری ہیں؟اس آرکی ٹیپل کے قدموں کے نشانات کہاں تک جاتے ہیں؟ نارنگ نے حالی کی شرح کو ڈی کنسٹرکٹ کیا ہے۔قفلِ ابجد دریافت کرنے کے بعد حالی کی شرح ہی سے اسے ڈی کوڈ کرتے ہیں جن خصوصیات کا ذکر حالی نے کیا تھا، ان لوازم کے سرچشموں کی دریافت حالی ہی سے شروع کر دیتے ہیں۔

نارنگ دوسرا باب بجنوری پر اس لیے قائم کرتے ہیں، کہ جو کچھ وہ پوچھ رہے ہیں اور جس چیز کی تلاش و دریافت جاری تھی وہ انہیں بجنوری کے ہاں نظر آتی ہے۔تو بجنوری سے سوال کرتے ہیں کہ محظ قول محال سے کام لیا ہے یا دیوان غالب اور وید مقدس کی جڑت میں کوئی حقیقی یا ارضی رشتہ بھی ہے؟ نارنگ کو بجنوری سے اپنے سوال کا جواب نہیں ملتا۔بجنوری تو صرف دیوان غالب کو وید مقدس سے جوڑ کے غالب کی اہمیت تسلیم کرا لیتے ہیں،مگر یہ قول نارنگ کے تھیسس کو بھی تقویت بخشتا ہے۔وہاں سے ان کے مؤقف کو مزید تقویت ملتی ہے کہ غالب کے ہاں موجود ایک جدلیاتی حرکیات کا نظام پایا جاتا ہے، جو غالب کے ہاں مضمون و خیال کی نیرنگی کا سبب ہے۔اس کے بعد وہ ''دانش ہند اور جدلیات نفی'' پر ایک باب قائم کرنے کے بعد دانش ہند میں غالب کی جڑیں تلاش کرتے ہیں۔دانش ہند میں تو ویدانت بھی آتا ہے۔مگر وہ کھوجتے کھوجتے دنیا کے سب سے قدیم (پانچ ہزار قبل عیسوی) فلسفے، بودھی فکر تک غالب کی فکر کے آرکی ٹیپل قدموں کے نشانات تلاش کرتے ہیں۔

مہاتما بدھ عمل پر زور دیتے تھے وہ ہر سوال پر ہمیشہ خاموشی اختیار کیے رہتے۔اس طرح موہن (خاموشی) کا فلسفہ بھی قدیم دانش ہند کا فلسفہ ہے۔اس سے تمام فلسفوں اور مذاہب نے اثر لیا ہے۔اس فلسفے کا ارضیت اور زندگی پر تمام تر اصرار ہے۔اس فلسفے کی نظریہ سازی ناگارجن نے کی، جس کا نام شونیتا ہے۔اس طویل سفر کے بعد نارنگ غالب کی فکر کے ان آرکی ٹیپل قدموں کے نشانات تک پہنچتے ہیں جو شونیتا ہیں۔نارنگ دانشِ ہند یا بودھی فکر و فلسفہ سے غالب کے فکری تعلق کو براہِ راست ہرگز ثابت نہیں کرتے بلکہ اس فلسفے کے قدموں کے نشانات یا آرکی ٹیپل یعنی لاشعوری اثرات دریافت کیے ہیں۔غالب لاشعوری راستوں سے بودھی فکر و فلسفہ شونیتا سے اثر لیتے ہیں جو جدلیاتی حرکیات بھی ہے نفی در نفی اور صفر الاصل بھی اور منتہائے دانش بھی۔

دوسرے غالب شناس، غالب کو وہاں ڈھونڈھتے رہے ہیں، جہاں وہ معلوم ہیں۔نارنگ ''دیباچہ'' میں ایک بڑھیا کا قصہ بیان کرتے ہیں جو گھر میں چابیاں گم ہونے کے باوجود چوک میں اس لیے تلاش کر رہی ہے کہ وہاں روشنی ہے۔یہی معاملہ دیگر تمام غالب شناسوں کا بھی ہے جو روشنی میں، جہاں غالب پہلے سے معلوم ہیں، وہیں روشن طبقات میں سے غالب کو تلاش کرتے ہیں۔یہ نارنگ کی انفرادیت ہے کہ وہ چابیاں گھر (مقامیت) کی تاریکی (یعنی نامعلوم پہلوؤں) میں ہی تلاش کرتے ہیں۔

غالب کا عجمی ہونا، ایرانی، تورانی اور افراسیابی ہونے پر فخر روزِ روشن کی مانند عیاں ہے۔یہ تو برحق ہے، کہ غالب کے آباو اجداد ایرانی، تورانی اور افراسیابی تھے اس طرح غالب ایرانی النسل ہوئے۔مگر غالب کی اٹھان تو ہندوستان کی مٹی سے ہوئی، وہ خود تو آگرہ کے تھے۔غالب پر فارسی کے اثرات بھی روشنی میں اور واضح ہیں۔نارنگ غالب کی سبک ہندی سے جڑت اور سبک ہندی کی زیرِ زمین جڑیں تلاش کرتے ہیں اور ساتھ ہی سبک ہندی کے نمائندہ شاعر بیدل کی فکر کے ڈانڈے دانش ہند سے ملاتے ہیں۔غالب بیدل کا اس لیے انتخاب کرتے ہیں کہ وہ سبک ہندی کے شاعر تھے۔ایرانیوں نے سبک ہندی کو اس لیے دھتکارا کہ اس کی جڑت فکری و فلسفیانہ طور پر ہندوستان سے تھی، جو عجمیت سے برعکس

تھی۔ سبک ایرانی کے دلدادہ ایک دم نئی اور انجانی فکر و ڈکشن کو کس طرح قبول کر سکتے تھے۔ سبک ہندی شناسوں نے آہستہ آہستہ اندازہ لگایا کہ اس فکر کی جڑیں ہندوستان کے فکر و فلسفہ سے چھوٹتی ہیں۔ مزید اس سے آگے کوئی نہ بڑھ سکا۔ فارسی کے بڑے نقاد پری گارنا، وارث کرمانی، بنی ہادی اور شمس الرحمٰن فاروقی بھی یہیں آ کر رُک جاتے ہیں۔ ان کی فکری پرواز یہی تک محدود ہے اس سے آگے ان کے پر جلتے ہیں۔ یہاں پر نارنگ نے سوال اُٹھایا ہے سبک ہندی، سبک ایرانی سے مختلف ہے، آخر کیوں۔۔؟ بیدل، ناصر سرہندی اور غالب کی شاعری خاقانی، عرفی، فیضی اور سعدی جیسی کیوں نہیں؟ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ سبک ہندی کی جڑیں، دانش ہندی میں کہاں، کہاں ہیں؟ ان کو تلاش کرنا نارنگ کا کارنامہ ہے۔ وہ کھوجتے کھوجتے جدلیاتی حرکیات تک پہنچتے ہیں جس کا گہرا تعلق بودھی فکر و فلسفہ شونیتا سے ہے۔ غالب نے بیدل کی اس وقت انگلی تھامی جب وہ حاشیہ نشیں تھے اور اہلِ فارس نے بیدل کو خارج از آہنگ کر دیا تھا۔ وہ بیدل کو شاعر ہی نہیں مانتے تھے۔

اس کے علاوہ غالب اور بیدل کے ہاں پائی جانے والی خاموشی، جس کی بنا پر فاروقی نے غالب کو مغربی علامت نگاروں سے جا ملایا اور اسلم انصاری نے اسے مابعد الطبیعات سے جوڑا ہے۔ اسلم انصاری سے سوال بنتا ہے کہ خاموشی کی مابعد الطبیعات کی جڑیں ہیں کہاں؟ اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی مابعد الطبیعات میں خاموشی کی جڑیں ہیں تو میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ اسلامی مابعد الطبیعات میں خاموشی ہے ہی نہیں بلکہ وہ تو ٹھوس ہے۔ جنت اور دوزخ، حیات مابعد ممات، یہ سب خیالی نہیں بلکہ ٹھوس تصورات ہیں۔ اسلام میں تو فلسفہ کو بدعت سمجھا جاتا رہا ہے۔ اسلام میں فلسفہ اخوان الصفا کے راستے سے داخل ہوتا ہے۔ یہ رسالے یونانی فلسفہ سے متاثر ہو کر لکھے گئے۔ یہ رسائل اسلام میں فلسفے کے پہلے نشانات ہیں جنہیں بغداد کے چوک میں نظر آتش کر دیا گیا۔ نارنگ نے غالب کے ہاں پائی جانے والی خاموشی کی جڑیں بدھ مت اور جین مت میں، تلاش کی ہیں۔ بدھ مت میں موہن (خاموشی) کا فلسفہ بہت مضبوط ہے۔ بدھ مت ہمیشہ موہن (خاموش) رہتے تھے۔ جب کچھ پوچھا جاتا تو وہ ہاتھ کے اشارے سے نفی میں جواب دیتے اور خاموش ہی رہتے۔ خاموشی کا فلسفہ بدھ مت سے جین مت میں آیا۔ شونیتا بھی خاموشی کا فلسفہ ہے۔ زین اس فلسفے کے بڑے پرچارک ہیں۔ بودھی فکر سے کبیر نے اثر لیا۔ کبیر کی اُلٹ وانسیوں میں خاموشی کے فلسفے کے کرشمے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح بودھی فکر سے بیدل و غالب نے بھی برابر اثر لیا ہے۔ نارنگ نے غالب کے ہاں موہن (خاموشی) کی جڑیں بدھ مت میں دکھائی ہیں۔

نارنگ نے بارہا لکھا ہے فارسی میرا میدان نہیں لیکن جو کام نارنگ نے کیا وہ دیگر فارسی اور سبک ہندی کے عالموں سے بھی نہ ہو سکا۔ وہ سبک ہندی، جدلیاتی حرکیات اور خاموشی کے فلسفے کی جڑیں کھوجتے کھوجتے بیدل کے ذریعے دانش ہندی اور دانش ہندی میں اپنی توجہ کا مرکز بودھی فلسفے کو بنایا ہے۔ بودھی فلسفے میں وہ شونیتا تک پہنچتے ہیں، جو جدلیاتی حرکیات اور جدلیاتی نفی، نفی در نفی، صفر الاصل اور خاموشی ہے۔ نارنگ نے شونیتا کی جدلیاتی نفی کو تناظر کے بجائے غالب کی تعبیر نو کا سیاق بنا کر پیش کیا ہے۔

نارنگ ایک طرف غالب کا رشتہ و یدانتی فلسفہ اور بودھی فکر سے جوڑتے ہیں تو دوسری طرف غالب کا رشتہ آج کی مابعد جدید فکر سے نارنگ نے اپنے تھیسس کو مضبوط بنانے کے لیے روایت اوّل، روایت دوم، متداول اور غیر متداول کلام کی تعبیر نو پیش کی ہے اور اپنے مؤقف (تھیسس کو بخوبی پایۂ ثبوت اور پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ نارنگ الگ اور منفرد راہ پر چلے، دوسروں کے لیے اس راہ پر چلنا تو درکنار، یہ راستہ آج تک کسی غالب شناس کو سوجھا بھی نہ تھا۔ منفرد اور نئے راہوں کی تلاش اور ان پر چلنا

نارنگ کا خاصا ہے۔ 'شافع قدوائی' نارنگ کی اس خصوصیت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں۔

''پروفیسر گوپی چند نارنگ ہمیشہ سے عمومیت زدہ رواج عام سے ہٹ کر چلتے آئے ہیں۔ مانوس اور مقبول تصور نقد یا رائج تصورات کی بے مائیگی اور تضادات کو خاطر نشان کرنا اور ادب کی تفہیم کے نئے فکری منہاج ہویدا کرنا پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقیدی ژرف نگاہی (Critical Acuity) کی قابلِ رشک امتیازی صفت رہی ہے۔ مسئلہ خواہ ترقی پسند تصورِ ادب کا ہو یا جدیدیت کی فکری اساس کا یا فکشن کی شعریات کی تشکیل کا یا پس ساختیاتی مباحث کے مختلف ادبی اصناف پر تخلیقی اطلاق کا، پروفیسر نارنگ نے ہمیشہ متن کے گہرے اور خیال انگیز تجزیوں سے تنقید کا ایک تازہ کار نیا ماڈل اور محاورہ قائم کیا ہے جو تعمیم زدگی یا محض نظری مباحث کی گونج سے آباد نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں بنیادی ہدف متن کا مرتکز آمیز مطالعہ ہے جس میں نہ صرف نئے علمیاتی اور فکری مباحث کی بصیرت ملتی ہے بلکہ وہ مختلف علوم کو محیط مبسوط اور جامع مطالعہ کو بروئے کار لاتے ہیں۔ نیز وہ ادراک معنی اور ترسیل معنی کی مختلف جہتوں کو تنقیدی دقتِ نظر کے ساتھ واضح کرتے ہیں۔''[۳]

نارنگ کی فکری جہات مسلسل ارتقاء پذیر ہیں۔ نارنگ کی یہ تصنیف نہ تو کسی کے رد یا جواب میں ہے اور نہ ہی کسی غالب شناس کی توسیع یا اضافے میں لکھی گئی ہے۔ یہ تنقید غالب کا منفرد اور اگلا قدم ہے۔ یہ کتاب غالب سے متعلق نئے مکالمے اور نئے بیانیے کا آغاز اور غالب کا نیا ڈسکورس ہے۔ اب تنقید غالب، حالی، بجنوری شیخ اکرام اور خورشید الاسلام کے ساتھ ساتھ نارنگ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ بلاشبہ نارنگ اپنے متقدمین اور معاصرین سے انفرادیت کے حامل غالب شناس ہیں۔ نارنگ غالب کے فلسفی نقاد کی حیثیت سے جانے جاتے رہیں گے۔

OOO

حوالہ جات

۱۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، ''غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص ۵

۲۔ ناصر عباس، نیئر، ڈاکٹر، ''غالب: معنی آفرینی جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات''، مشمولہ: پیلوں، ملتان، شمارہ نمبر ۱۳، جنوری تا مارچ، ۲۰۱۶ء، ص ۳۲

۳۔ دانش الہ آبادی، ''گوپی چند نارنگ اور غالب شناسی''، نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۴ء، ص ۸۳

قلم کاروں سے التماس

☆ برائے کرم مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔

☆ مقالہ صفحے کی ایک جانب لکھا ہوا ہو۔

☆ سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔

☆ کمپوز کیے ہوئے مسودہ کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔

☆ اپنے مضامین اور تخلیقات "idarasabras@yahoo.in" پر بھیج سکتے ہیں۔

علی احمد فاطمی

مضمون

انارکلی حقیقت یا فسانہ

مرزا حامد بیگ ایک سینئر اور کہنہ مشق فکشن نگار ہیں۔ اپنے معیاری فکشن کے ذریعہ انھوں نے اردو کی عالمی دنیا میں ایک معتبر وموثر پہچان بنائی ہے۔ مرزا حامد بیگ فکشن کے علاوہ ایک عمدہ اسکالر، دانشور، محقق اور ناقد بھی ہیں۔ اس میدان میں بھی ان کے کئی بڑے تحقیقی وتنقیدی کارنامے اعتبار کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

انارکلی ان کا تازہ ترین ناول ہے جو گذشتہ دنوں ہندو پاک میں شائع ہوکر پذیرائی حاصل کر رہا ہے۔ ان کے تخلیقی وتحقیقی سفر میں غالباً پہلی بار ایسا ہوا ہے جہاں تحقیق وتخلیق بڑے پیمانے پر باہم شیر وشکر ہوئے ہیں۔ وہ بھی انارکلی جیسے فرسودہ، پامال موضوع پر چوں کہ مرزا صاحب کا تعلق لاہور سے ہے اور انارکلی کا تعلق بھی لاہور سے تھا۔ لیکن یہ نسبت کسی بڑے کام کے لیے کافی نہیں لاہور تو علم وادب کا مرکز رہا ہے بے شمار شاعر وادیب کل بھی تھے اور آج بھی ہیں لیکن غالباً امتیاز علی تاج کے بعد یہ دوسرے ادیب ہیں جنھوں نے اس فرسودہ موضوع کو اپنی تخلیق میں جذب وپیوست کیا اور دہائیوں کی تلاش وتحقیق، محنت وریاضت کے بعد اسے ایک نئی زندگی دی۔ ناول میں تخیل کی روانی، قصہ کہانی زیادہ ہوا کرتا ہے اور انارکلی کے قصہ میں بھی طرح طرح کی روایات اور کہانیاں شامل ہو گئی ہیں لیکن فاضل مصنف نے تمام تر روایات قصہ کہانی کو ردّ کرتے ہوئے پوری تحقیق وصداقت کے ساتھ غیر معمولی ریسرچ کے بعد اسے پوری سچائی حوالوں اور مثالوں کے ساتھ پیش کیا۔ ایسی صورت میں ناول کی کیفیت وتخلیقیت کے متاثر ہونے کا خطرہ تو بنتا ہی ہے اور شاید کہیں کہیں بنا بھی۔ لیکن اسے درگزر کرنا اس لیے ضروری ہوا کرتا ہے کہ تاریخ جب بھی ناول کا موضوع بنتی ہے یہ خطرہ ازخود در آتا ہے۔ خواہ وہ آگ کا دریا ہو یا کئی چاند تھے، لیکن اس ناول کو تاریخی ناول کہنا بھی غلط ہوگا۔ شاید اسی لیے خود مصنف نے عنوان میں ہی اسے تاریخی کے بجائے دستاویزی ناول کہا ہے۔ تاریخی ناول اس کا ماحول، اس کے تقاضے کچھ اور ہی ہوا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں بھی کچھ باتیں درمیان میں آسکتی ہیں۔

ناول کا آغاز رومانی انداز سے ہوتا ہے۔ چمچماتی کار، لانگ کوٹ اور مال روڈ، سب کچھ رومانی اور غیر تاریخی، چند نوجوانوں کے کردار سے ناول کا آغاز ہوتا ہے جو مصروف تحقیق ہیں اور ان کا موضوع تحقیق ہے کہ ''انارکلی حقیقت تھی یا فسانہ؟'' اس گروپ کو اسی موضوع پر ایک فلم بنانی ہے۔ اسی لیے کچھ دیر فلمی باتیں اور اصطلاحیں درمیان آتی ہیں جو ناول کے ماحول سازی میں معاون ہوتی ہیں۔ لاہور کے گردوپیش کا علاقہ اور لاہور میں ہی انارکلی، اور انارکلی میں لاہور، یہ گروپ ایک ریستوران میں داخل ہوتا ہے۔ یہ انداز دیکھئے۔

> ''مرحبا ایئر کنڈیشنڈ کے شفاف شیشوں والے صدر دروازے پر انارکلی نے مغلیہ دور کے دربانوں کی طرح جھکتے اور اپنا جھولہ نما پرس کورنش بجالانے کے انداز میں بار بار اپنی پیشانی تک اٹھاتے ہوئے سب کو خوش آمدید کہا''

یہ اسلوب ناول کو اصل مرکز کی طرف لے جانے کا ایسا تخلیقی اشاریہ ہے جو ماہر ناول نگار کی مہارت وریاضت کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس کا ہر لفظ ہر قدم مرکز کی طرف گامزن رہتا ہے جس کا اندازہ عام قاری کو مشکل سے ہوسکتا ہے۔ ریستوران کے صدر دروازے پر ہی انارکلی کے طرز پر کنیزانہ انداز میں استقبال کرنا صورت حال کو تخلیق انگیز اور معنی خیز بناتا ہے۔

ادھر انارکلی تو ادھر شہریار مرزا، تاریخ کا ریسرچ

اسکالر، انارکلی کی حقیقت کی تلاش، ایک ڈاکٹرنذیر برلاس ہیں تاریخ کے پروفیسر ایک نسیم ظفر جو آثار قدیمہ کے ماہر ہیں۔ ایک ہد ہد ہیں۔ کچھ اداکار، کچھ رومان، کچھ داستان، کچھ اساطیر، اور کچھ تاریخ، یہ سب کہ سب خانسپور کے ریسٹ ہاؤس میں قیام پذیر، ان کرداروں کو ماحول کو پیش کرنے میں مصنف نے مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ یہاں بھی عشق ومحبت اور رومانیت کا برابر سے دخل رہتا ہے جس میں انارکی کلی برابر سے شریک ہے جس کا اصلی نام شازیہ حیات ہے لیکن کیفیت وجاذبیت انارکی کلی کی طرح، دوراور زمانہ کوئی بھی ہو۔ انارکی کلیاں تو ہر موسم اور ہر دور میں کھلتی آئی ہیں۔ عشق تو ہر دور میں ہوتا آیا ہے۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ قدیم انارکلی فارسی بولتی رہی ہوگی اور نئی انارکلی انگریزی کہتی ہے "I am Shazia Hayat" اس فرق کو بھی سمجھتے چلنے کی ضرورت ہے اور اس جذبہ وتجسس کو بھی کہ نئے لوگوں کو پرانی انارکلی کے اصل کردار کی تلاش کیوں ہے۔ کیا یہ محض تلاشِ حقیقت ہے یا تلاش محبت، اس لیے کہ محبت کا جذبہ تو ہر دور میں رہا ہے۔ ہزار پرانا ہونے کے باوجود نیا نیا سا رہتا ہے تبھی تو فراق گورکھپوری نے کہا تھا۔

ہزار بار زمانہ ادھر سے گذرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

اور یہ ناول بھی یہی کہہ رہا ہے۔ اسی فطری عمل وجذبہ کے حوالے سے ہی ناول کا پلاٹ، تانا بانا اور سارے کردار اس حقیقت کی تلاش یا تلاش کے اظہار میں ایک مقام پر جمے ہوتے ہیں جن کا مقصد خاص ہے۔

''چند روز کے لیے ہم لوگوں کے یہاں جمع ہونے کا مقصد روایتی انداز میں ایک تاریخی فیچر فلم کی کاغذی تیاریاں نہیں بلکہ ہماری کوشش ہوگی کہ باہمی گفت وشنید میں مستند تاریخی حوالہ جات سے اس المیے کی حقیقت جان سکیں اور ایک ایسا خاکہ ابھارنے کی کوشش کریں جسے فراموش کردہ تاریخی حقیقت کہا جاسکتا ہے۔''

فلم کی اسکرپٹ (Script) کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے۔

''شہر لاہور اور عہد اکبری کا شاہی قلعہ 1584ء تا 1599ء کا وہ زمانہ جس میں اکبر آباد کے بجائے بیشتر وقت اکبر نے لاہور میں گزارا۔ کیوں؟ اس پر آگے چل کر بات کرتے ہیں۔ لیکن اس کا ایک پس منظر بھی ہے۔''

ناول کا اصل باب لاہور کی وجہ تسمیہ۔ لاہور کی تاریخ وغیرہ سے شروع ہوتا ہے جسے رام چندر جی کے بیٹے لوہ نے بسایا تھا۔ پرانی تاریخی کتابوں میں اس کا نام لوہ آور ملتا ہے جس کا مطلب ہے لوہ کا قلعہ۔ لوہ آور ہی لاہور بن گیا۔ مصنف نے لاہور کے نام اور تاریخ پر قیمتی معلومات فراہم کی ہیں۔ لاہور کے ساتھ ساتھ اکبر بادشاہ کی شخصیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ بظاہر ان تحریروں کو پیش کرنے میں تاریخ پورے طور پر درآتی ہے اور ناول غائب سا ہونے لگتا ہے لیکن انارکلی جیسے موضوع پر ناول لکھنے کے لیے لاہور اور اکبر کے کردار کا اصل تعارف ضروری بھی تھا۔ اچھی بات یہ ہے کہ معلومات ناول کے ایک کردار کے ذریعہ سامنے آتی ہیں اس سے زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ اکبر کے صوفیانہ کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے جہاں بادشاہت کا جلال کم ہے تصوف کا جمال زیادہ ۔ یہ جملے دیکھئے۔

''تیرہ چودہ سال کے لیے لاہور منتقل ہونے سے پہلے 1577ء میں اکبر خود کو ایک رومانی پیشوا خیال کرنے لگا تھا۔ 30/جنوری 1578ء کو شادی دال کے مقام پر اس نے جمعہ کے دن گوشت خوری ترک کردینے کا اعلان کیا اور اس کے کچھ بعد اکبر نے لہسن اور پیاز کھانے سے بھی ہاتھ روک لیا''۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ موت کے بعد اس کے سادہ مقبرہ سکندرا میں کل بھی اور آج بھی ہر مذہب وملت کے لوگ نظر آتے ہیں۔ غرض کہ

ناول اپنے حالیہ کرداروں کے ذریعہ بادشاہ اکبر کی بادشاہت، طاقت، رومانیت، مذہبی عقیدت وغیرہ کی ملی جلی دلچسپ تصویر پیش کرتا ہے۔ خاص طور پر دودھ شریک بھائی ادھم خاں، جس نے ایک وزیر کا قتل کر دیا تو اکبر نے از راہِ انصاف ادہم خاں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جس سے اس کی نفسیات ابھرتی ہے کہ جو بادشاہ حکومت کے عدل وانصاف اور حفاظت کے لیے اپنے دودھ شریک بھائی کا قتل کروا سکتا ہے تو وہ اپنے خاندان، حکومت کے تحفظ کے لیے انارکلی جیسی کنیز کو بھی زندہ درگور کر سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ جملہ بھی ملتا ہے۔ ''آئینِ اکبری میں ابوالفضل نے جہاں پر چھوٹی بڑی سزا کا ذکر کیا ہے وہاں دیوار میں چن دینے کی جانب اشارہ تک نہیں کیا۔'' اس کے فوراً بعد یہ جملہ ''عہد اکبری میں لاہور کیسا تھا؟'' اس کے بعد لاہور کی تہذیبی ثقافتی معلومات کا ذخیرہ فراہم ہوا ہے جو ضروری اس لیے ہے کہ اس دور میں لاہور رقص، موسیقی، مصوری، تجارت وغیرہ کا مرکز بن گیا۔ دور دراز کے فنکار لاہور آ آ کر بسنے لگے۔ بقول مصنف اس سادہ سے منظر نامہ میں کچھ تشنگی بھی ہے اور پھر ایک معنی خیز جملہ۔

''یہ محض ایک فراموش کردہ حقیقت کی کھوج نہیں انسانی حقوق کا معاملہ بھی ہے'' اور یہیں سے تاریخ ناول میں تبدیل ہونے کا جواز پیش کرتی ہے اس لیے کہ تاریخی کتب میں اکثر بادشاہوں کے واقعات ہی درج ہوتے ہیں اکثر طاقتور بادشاہ اپنی مرضی کے مطابق تاریخ لکھواتے ہیں۔ لیکن ناول کا تعلق انسان، انسانی سرگرمی، انسانی معاشرہ سے ہوتا ہے۔ والٹر نے غلط نہیں کہا تھا ''ناول وہ ہے جس کا موضوع انسانی زندگی ہے اور جس کا ذریعہ حقیقت نگاری ہے'' اور ان کی زندگی کو پیش کرنے کی صلاحیت جتنی اس صنف میں ہے اتنی کسی صنف میں نہیں اسی لیے ماضی تا حال عوامی سچائیوں اور انسانی تلخ وشیریں سرگرمیوں کو جس قدر ناول پیش کرتا ہے کوئی اور صنف نہیں۔ اسی وجہ سے تاریخ نے بھی ادب کی تمام اصناف سخن میں ناول کی صنف کا احترام کرتے ہوئے نہایت گرم جوشی سے گلے لگایا۔ ویسے بھی فکشن اور تاریخ ایک دوسرے کے اتنے قریب ہیں کہ دونوں کا ایک دوسرے میں ضم ہو جانا فطری ہے۔ کہانی انسانی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے اور تاریخ اس زمین پر انسانی زندگی کے ماضی کی کہانی ہوتی ہے۔ دونوں میں رشتہ لازمی ہے۔

اب ناول رفتہ رفتہ کنیز نادرہ کی طرف مڑتا ہے اور اس کا تعارف ایک کردار کچھ یوں کراتا ہے۔

> ''مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کے ہندوستان میں شاہی قلعہ لاہور کی ایک کنیز نادرہ، جو ایران میں پیدا ہوئی یا ملک ترکستان میں، وہ کسی تجارتی قافلے کے ہمراہ ہندوستان چلی آئی یا اس کی قیمت چکائی گئی اور وہ بہ طور کنیز شاہی قلعہ لاہور تک پہنچی، اب کچھ وثوق سے کہنا مشکل ہے، البتہ جب جوان ہوئی تو شہنشاہِ ہند، اکبر نے اس کی سرخ وسفید رنگت اور حسن و جمال کے سبب انارکلی کے خطاب سے نوازا اور داخل حرم کیا۔''

اور پھر فوراً ایک سوال.... ''سوال یہ ہے کہ وہ کس انجام کو پہنچی'' ماضی کے سارے دروازے بند ہیں۔ یہ معنی خیز جملہ ''انارکلی کے مقبرے سے متصل، اجڑے ہوئے باغ کے سینے پر ہم نے ان گنت عمارات کی بنیادیں اٹھا دیں۔ اب کون بولے گا بھلا؟''

لیکن ناول بولتا ہے اور ناول کے لکھے جانے کا مقصد بھی یہی ہے۔ ناول نگار نے کرداروں کے ذریعہ مختلف سوالات ضرور قایم کیے ہیں لیکن پھر یہ بھی کہا۔ ''عہد اکبری کا سورج تو خاموش ہے۔'' موافق بھی اور مخالف بھی۔ اسی خاموشی کی وجہ سے ناول نگار کا ذہن بولتا ہے۔ قلم بولتا ہے اور تاریخ بولتی ہے اور یہ جملہ بولتا ہے۔ ''یقیناً انارکلی کے دیوار میں چنے جانے کا واقعہ پیش آیا۔'' اسی یقین کو دستاویزی حقائق کے ساتھ ناول تاریخ کے ایک بڑے سچ کی نقاب

کشائی کرتا ہے لیکن اسے پھر بھی تاریخی ناول نہیں کہا جا سکتا۔ ناول میں ایک تجسس جسے تلاش حقیقت بھی کہا جا سکتا ہے، بیدار ہوتا ہے جو تاریخ کو رومان میں بدلتا ہے اور رومانیت کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ گمشدہ اور تباہ شدہ چیزوں میں سانس لیتی ہے۔ اسی وجہ سے تاریخ کا رشتہ رومانیت سے گہرا ہو جاتا ہے۔

انارکلی کا قصہ اگر ایک طرف تاریخ ہے تو دوسری طرف رومان ہی رومان ہے۔ ناول کے تقریباً پچاس صفحات تمہید اور فضا سازی میں صرف ہوتے ہیں۔ مصنف نے ناول کی تکنیک میں حال اور ماضی دونوں کو متوازی طور پر لا کر ایک ایسی رومانی حقیقت کی فضا قایم کر دی جس سے ناول کے برتاؤ و رویہ میں نیا پن تو آتا ہی ہے۔ نیز دلچسپی و دلکشی کے نئے نئے سامان بھی مہیا ہوتے ہیں اور ساتھ ہی رومان اور انسان کے فطری اور لازوال رشتوں پر کچھ اس انداز سے روشنی پڑتی ہے کہ جذبہ و طبقہ اور فلسفہ سب شیر و شکر ہونے لگتے ہیں اور ایک بے نام سا تجسس از خود سر اٹھانے لگتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے جو ماضی اور اس سے زیادہ حال کو کس دلکش اور رومانی انداز سے سامنے آتا ہے۔

''اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر سرمئی شال والی۔ انار کلی رات کو ہچکیاں لے کر روتی رہی تو آج کانفرنس ہال میں، نیلی آنکھوں والی مدیحہ اور سنی کیوں نہیں دکھائی دیئے۔ کہاں ہیں وہ دونوں؟ سامنے وادی میں گھنے درخت آپس میں سر جوڑے کھڑے تھے۔ وہ کچھ دیر برآمدے میں گم سم کھڑا اپنے بالوں میں انگلیوں کرتا رہا اور پھر جانے کیا سوچ کر دھیرے دھیرے شاداب وادی کی طرف نکل جانے والی ترائی میں اتر گیا۔''

محقق پروفیسر نیرنگ کے ذریعہ تحقیق و تاریخ کے کچھ اوراق پھڑ پھڑاتے ہیں۔ شہزادہ سلیم کی لیاقت اور علمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ درمیان میں یہ ٹکڑا عجب بے ربطی کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔

''یہ سب تو تھا لیکن عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ شہزادہ سلیم نے انارکلی سے ناکام محبت کے بعد تخت نشین ہو کر نور جہاں سے شادی کی۔ یعنی شہزادہ سلیم کی جذباتی دنیا صرف انھیں دو عورتوں تک محدود تھی جب کہ حقیقت بہت مختلف ہے۔''

اور یہی بے ربطی پھیل کر تحقیق میں بدل جاتی ہے اور تخلیق تھوڑی دیر کے لیے پسِ پشت چلی جاتی ہے لیکن شہزادہ سلیم کی سولہ شادیوں کا ذکر بھی خاصا رومانی ہے جو معلومات کے ساتھ ساتھ بادشاہوں کے رویوں اور طور طریقوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ درمیان میں انارکلی کا عشق بھی ہے۔ یہ ساری تفصیل تحقیق ڈاکٹر نیرنگ پیش کرتے ہیں اور سبھی کارکنان سمجھتے ہیں سمجھاتے ہیں اس لیے کہ اس کرادر پر انھیں فلم تیار کرنی ہے۔ ان کی یہ حیرانی فطری تھی کہ سولہ شادی کرنے کے بعد بھی شہزادہ سلیم انارکلی کے عشق کے قصے اور ڈاکٹر سرجیت کور کا سوال..... ''سولہ شادیاں! تو پھر یہ انارکلی کے ساتھ کیا تھا ڈاکٹر صاحب؟''

''شاہزادہ تھا اور وہ ایک کنیز'' اگلے سشن میں آپ کی ساری الجھنیں رفع ہو جائیں گی۔ اور یہ باب اس تجسس پر ختم ہوتا ہے۔ رومان انگیزی کی یہ کیفیت اور حال کے لوگوں کے ذریعہ بنائی گئی حقیقت اسے پورے طور پر تاریخی ناول نہیں ہونے دیتی۔ ایسا ضروری بھی نہیں ناول کا موضوع اگر تاریخ ہو تو وہ تاریخی ناول کہلائے۔ مصنف نے ایک نئی تکنیک کے ساتھ ناول کو پیش کیا ہے جس سے وہ نیم رومانی اور نیم تاریخی ناول بن جاتا ہے اور اس سے زیادہ دستاویزی کہیں کہیں معاشرتی بھی لیکن ناول اول تا آخر ناول ہی ہے۔ ہر قسم کے ناول کی پہلی و آخری شرط یہی ہوا کرتی ہے اس لیے کہ وہ ناول لکھ رہا ہے۔ تاریخ و سماج کی دستاویز نہیں۔ باقی ناول نگار کو ہر طرح کی آزادی کہ وہ برتاؤ اور سلوک چاہے جیسا کرے۔ حال کو ماضی سے ملائے یا ماضی کو حال سے لیکن درمیان میں ایک

منطق اور تخلیقی ربط ضروری ہے اور جذبہ عشق سے زیادہ فطری ربط اور کیا ہوسکتا ہے کہ اظہار عشق اور معاملہ عشق کے طور طریقے خواہ کتنے ہی بدل جائیں لیکن جذبہ عشق تو لافانی ہے۔ امر ہے اور ہمیشہ ایک سا خواہ وہ بادشاہ یا شہزادے کا ہو یا عام انسان کا ایک نامعلوم اور غیر محسوس سا ربط اس ناول کو دو عہد سے جوڑے رکھتا ہے جو ناول کو یکسانیت سے بچاتا ہے اور انسان و رومان کے لافانی کردار کو انکار و اطوار میں بدلتا جاتا ہے۔

بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے آگے پیچھے کا عمل شٹیل کاک کا دور جا گرنا۔ In اور Out کا کھیل اور مدیحہ کی نیلی آنکھیں اور صفیہ کا All Love کہنا۔ ان سب سے ایک رومانی کولاج تو بنتا ہی ہے۔ کبھی ہیروز یرو بنتا ہے اور کبھی زیرو ہیرو، یہ سب کہ سب بڑے معنوی اور منطقی اشارے ہیں جو تاریخ کو ناول بنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور اسی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ انارکلی تاریخ کا ایک رومانی کردار ضرور ہے لیکن مصنف نے پوری صداقت اور خلاقانہ بصیرت کے ساتھ اسے ناول میں پیش کیا جو آسان نہ تھا۔ کرداروں اور مکالموں کے ذریعہ اور اس سے زیادہ انسانی رشتوں کے حوالے سے ایک فطری تجسس تعمق کے ساتھ!!

اگلے باب کا مزاج کچھ دوسرا ہی ہے اگرچہ مرکز میں انارکلی ہی ہے۔ پہلی بار انارکلی پر ڈرامہ کب لکھا گیا اور اس میں انارکلی کی موت و حیات کی تفصیل کیا ملتی ہے۔ گفتگو اور مکالموں کے ذریعہ محمد دین فوق کے ناول، انگریزی ڈراما، ڈرامہ کا ترجمہ سندر لال کی تحریر، امتیاز علی تاج کچھ اور درمیان میں دلچسپی کے رویے بھی کچھ اور۔ تاریخ کی خشکی سے بچانے کے طور اور ناول بنانے پر ہمہ وقت غور اور تمام تر تحقیق کے باوجود ناول بنتا چلا جاتا ہے۔ ان کے لیے بطور خاص جو تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اتنی ہی تخلیقی ادب سے بھی۔ بہرحال کوئی کچھ بھی کہے انارکلی سے متعلق اردو ادب میں کیا کیا کارنامے انجام پائے اس پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

اگلے باب کا موضوع ہے۔ انارکلی حقیقت تھی یا فسانہ، باب کوئی بھی ہو مرکز میں انارکلی ہے۔ اسی لیے ناول کا نام ہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انارکلی کا کردار مرکز میں ضرور ہے لیکن خود کہیں نظر نہیں آتا اس کی نقل و حرکت اس کے مکالمے نہیں ہیں لیکن پھر بھی دلچسپی قایم رہتی ہے اور وہ مرکز میں رہتا ہے۔ نئے باب میں میر نسیم ظفر کا تفصیلی و تحقیقی بیان سامنے آتا ہے۔ ایک نیا تجسس بیدار ہوتا ہے اور تجسس داستان، قصہ کا ہی نہیں انسانی فطرت کا ایک ایسا لازمی و نفسیاتی عنصر ہے کہ اس پر تہذیب کا ارتقا قایم ہے۔ تحیر و تجسس اور تحفظ کے فکر و عمل نے ہی انسانی تہذیب کی تشکیل و تعمیر کی۔ گھر بنوانے کے آلات سے لے کر ملبوسات تک کا سلسلہ خارجی موسم اور باطنی سرد گرم کے ہی نتائج ہیں۔ بچہ کی فطرت میں کیا کیوں پیوست ہے۔ انسان کی فطرت میں اس سوال کا جواب یا تلاش جواب، انارکلی کا قصہ پوشیدہ یا غیر پوشیدہ، یہ سبھی اسی انسانی فکر و عمل کا رویہ ہے جو فطرت نے اس کے پیچ و خم میں چھپا رکھا ہے۔ مورخین نے اسے چھپایا تو مفکرین اس پوشیدگی کو بے نقاب کرنے پر آمادہ۔ کہہ سکتے ہیں کہ ناول کی مرکزی حقیقت انسان کی اسی فطرت سے ہم آہنگ ہے اور ناول کی ابتدا میں ہی آیا ہوا یہ جملہ انسانی حقوق کی بھی تلاش، ایک طرف بادشاہ کا انصاف یا ظلم تو دوسری طرف ایک کنیز کا جذبہ محبت اور غیر معمولی قربانی و ایثار اور شہزادے کا کردار جو سولہ شادیوں کے باوجود انارکلی سے دیوانہ وار پیار کرتا ہے اور شہزادہ ہو کر بھی ناکام ہوتا ہے۔

درمیان میں ولیم فنچ آئے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے انارکلی کے مقبرے کو بنتے دیکھا۔ یہ وہی ولیم فنچ ہے جس نے جہانگیر کی اجازت سے پہلی بار ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد ڈالی تھی۔ وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ لاہور میں شیخ فرید کی خوبصورت مسجد کے پاس دانیال شاہ کی ماں کا مقبرہ ہے جو اکبر کی بیگمات میں سے ایک تھی اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سلیم اس لیے بھی

ملوث تھا اس کا نام انارکلی یا اس رس بھرا انار تھا جب بادشاہ اکبر کو پتہ چلا تو اس نے انارکلی کو اپنے محل کی دیوار میں زندہ چنوا دیا جس میں وہ مرگئی۔ جسے بعد میں جہاں گیر نے مقبرہ میں تبدیل کر دیا، ناول نگار نے فنچ کی اطلاعات کو درست مانا ہے اور درست ہونے کے دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ فنچ کے حوالے سے مصنف نے جو نتیجہ خیز بات کہی ہے اسے آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔

''لاہور میں واقع انارکلی سے موسوم مقبرے کا محلِ وقوع وہی ہے جو ولیم فنچ نے بتایا۔ ہم سول سکریٹریٹ پنجاب کے پچھواڑے کرشن نگر کے رستے میں دائیں جانب اس عمارت کو آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔''

اور اس پر 1023ھ اور 1615ء کی تاریخ آج بھی درج ہے۔ دارشکوہ جو باقاعدہ مفکر اور صوفی تھا چالیس سال کے بعد اپنی کتاب ''سکینتہ الاولیا'' میں اس حصہ کو باغ انارکلی کہا ہے۔ انگریز مصنفین سفرنامہ نویسوں نے بھی اس واقعہ کو صاف گوئی کے ساتھ لکھا ہے۔ ایڈورڈ ٹیری نے اپنے سفرنامہ Voage to East India میں، ص ۱۳۰ پر صاف طور پر لکھا ہے۔

''موجودہ بادشاہ جہانگیر کے باپ شہنشاہ اکبر نے جہانگیر کو تخت و تاج سے محروم کر دینے کا اسی لیے سوچا تھا کہ اس نے اپنے باپ کی سب سے چہیتی بیوی انارکلی سے ناجائز تعلق قایم کر لیا تھا۔ دیگر اختلافات بھی بے شک رہے لیکن وہ سب اکبر کے بستر مرگ تک پہنچنے سے ختم ہو گئے''

کچھ اور معتبر شہادتیں اور حقیقت ثابت کرتی ہیں کہ انارکلی بادشاہ اکبر کی سب سے خوبصورت اور پسندیدہ بیوی تھی اس سے اکبر کے بیٹے جہانگیر کے تعلقات ہو گئے تھے جس کی پاداش میں وہ اس سزائے حبس سے گزری جس کی شہرت عام طور پر ہے عمل بظاہر طاقت اور اقتدار کا تو ہے ہی معاملات عشق کا بھی ہے کہ عشق نہ رشتہ دیکھتا ہے نہ دبدبہ نہ خوف نہ طوق، یہاں یہ نکتہ ابھرتا ہے کہ انارکلی اکبر کی بیوی تھی یا لونڈی، مصنف کا یہ جملہ دیکھئے اس میں شک نہیں کہ دانیال شاہ کی والدہ (انارکلی) اکبر کے حرم کی ایک لونڈی ہی تھی۔ لونڈی یا بیوی کا فرق ہندوستانی مورخین تو سمجھتے ہیں لیکن مغربی مورخین نہیں اس لیے انارکلی کبھی بیوی کے طور پر مشہور ہوئی تو کبھی لونڈی۔ لیکن تزکِ جہانگیری میں جہانگیر نے صاف طور یہ لکھا ہے ''ایک لونڈی کے بطن سے ایک اور بیٹا پیدا ہوا چونکہ اس کی پیدائش خواجہ معین الدین چشتی کے روضہ کے ایک مجاور شیخ دانیال کے گھر میں ہوئی اس لیے اس کا نام دانیال رکھا گیا۔'' کچھ کا رآمد بحث آگے بڑھتی ہے۔ مصنف نے جہانگیر سے جزوی طور پر اختلاف کیا نیز انگریز مورخین سے بھی اختلاف ہوتا ہے اور اس اختلاف کی دلچسپ وجہ بھی سامنے آتی ہیں اور پھر یہ نتیجہ ''یوں آنارکلی شہزادہ دانیال کی ماں نہیں ہوئی کوئی اور لونڈی تھی اس کا اکبری حرم سے ہونا کئی دیگر حوالوں سے بھی ثابت ہوتا ہے۔''

کچھ اور تازہ ترین حوالے سامنے آتے ہیں جس میں انارکلی کو بیوی کم کنیز زیادہ بتایا گیا ہے اس لیے کہ دانیال کی ماں 1596 میں وفات پا چکی تھیں اور انارکلی 1599 یعنی تین سال بعد چنوائی گئی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دانیال کی ماں اور انارکلی دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ انارکلی بیوی نہیں کنیز تھی اور کچھ نے تو اس کے وجود سے ہی انکار کیا اور پورے قصہ کو بے نیاز قرار دیا۔ تاج نے جوڈرامالکھا اس میں صاف طور پر لکھا۔

''جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں تاریخی اعتبار سے یہ قصہ بے بنیاد ہے۔ خود داستان میں اندرونی شہادتوں کی بنا پر کئی ایسے نقائص ہیں جن کی وجہ سے قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ امتیاز علی تاج''

اور مصنف کا کہنا ہے کہ ''انارکلی بطور شاہی حرم کی ایک کنیز تھی'' اس کے مقبرے پر اس کا نام اس لیے درج نہیں ہے کہ مغل بادشاہ صرف بیگمات کے نام درج کرتے تھے کنیز کا نہیں۔ مصنف نے

دیگر مورخین کی غلطیوں کی وضاحتیں کی ہیں اور اس طرح انارکلی اور جہانگیر سے متعلق چند دلچسپ اور معنی خیز انکشافات سامنے آتے ہیں لیکن تھوڑی دیر کے لیے ناول کم تاریخی دستاویز زیادہ بن جاتا ہے۔ تاریخی ناول یا تاریخی موضوع کی یہ ایک شکل ہوا کرتی ہے کہ اس میں تاریخی حقائق کے مسائل درپیش ہوتے ہیں لیکن سماجی اور معاشرتی مسائل اکثر غالب ہوجاتے ہیں جو ناول کی اصل روح ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے تاریخی ناول کے تاریخی کتب بننے کا خطرہ ہر وقت بنا رہتا ہے۔ اسی لیے تاریخی ناول، ناول کی تمام قسموں میں سے زیادہ پیچیدہ و نازک ہوا کرتی ہے۔ فرانسیسی پال گربونے دونوں کے ربط کے بارے میں تو یہاں تک کہہ دیا کہ ''تاریخی ناول'' ناول کے کٹر دشمن ہوتے ہیں۔'' پروفیسر بیٹر فیلڈ نے ایک جگہ لکھا۔ تاریخی ناول ایک اچھی کتاب ہوسکتا ہے ایک اچھا ناول نہیں ہوسکتا جب تک کہ تاریخ اور ناول کی چول بیٹھ نہ جائے'' ان مباحث سے قطع نظر انارکلی ناول کو لے کر یہ بحث کی جاسکتی ہے کہ آیا۔ تاریخی ناول ہے یا نہیں کیا محض تاریخ کے موضوع کو مرکز میں لانے سے کوئی ناول تاریخی نہیں ہوسکتا ہے۔ یہ بحث طولانی ہے۔ قصہ مختصر ہے کہ یہ ناول تاریخی ہے ہی نہیں لیکن ناول تو ہے تو پھر اس ناول کی ہیئت، ساخت، کمیت اور کیفیت اسے کن سرحدوں میں لے جاتی ہے اسے تو درگزر نہیں کیا جاسکتا۔

انارکلی کے وجود اور عدم وجود کی بحث ناول کو آگے بڑھاتی ہے اور نصف سفر کے بعد ایک اہم سوال جاگتا ہے کہ انارکلی کے واقعہ کے ضمن میں بقول مصنف ''عہد اکبری اور عہد جہانگیری کے مقامی اور ایرانی مورخین خاموش کیوں ہیں؟ انھوں نے یہ واقعہ کیوں نہیں لکھا؟ پھر خود ہی جواب ملتا ہے۔

> ''اکبری عہد میں عتاب شاہی کا خطرہ اور عہد جہانگیری میں بھی وہی خطرہ اس لیے موجود تھا کہ عہد جہانگیری کا مورخ دربار میں سابقہ باغی شہزادہ سلیم کی زبان سے اکبر کے حوالے سے والد بزرگوار عرش آستانی اور عرش مکانی کے حکمات ہی سنتا تھا۔ توزک میں جہانگیر نے ابوالفضل کے قتل سے متعلق باب میں سانحہ انارکلی کا ذکر نہیں کیا تو کس کی مجال تھی کہ حقیقت لکھے''۔

لیکن عرفی شیرانی جو شہزادہ سلیم کا اتالیق تھا اس کے قصیدہ کے آخری دو اشعار بقول مصنف۔

> ''یہ سچائی ثابت ہوجاتی ہے کہ انارکلی بہ طور لونڈی شہنشاہ اکبر کے حرم میں داخل تھی اور ولی عہد سلطنت شہزادہ سلیم سے اس کا معاشقہ چل رہا تھا۔ ان اشعار سے یہ بھی ثابت ہے کہ اکبری حرم کی یہ لونڈی شہزادہ دانیال کی ماں نہیں کوئی اور کم سن لونڈی ہے۔''

اس کے بعد عرفی کے اشعار درج ہیں اور اردو میں اس کے معنی بھی پھر مصنف نے یہ افسوس بھی ظاہر کیا ہے۔

> ''افسوس! کہ عرفی شیرازی بہ عمر چھتیس برس، زہر خوانی کے سبب 1591ء میں بہ مقام لاہور وفات پا گیا۔ بہ صورت دیگر وہ 1599ء میں انارکلی کے زندہ درگور کردیئے جانے کا ذکر بھی اپنے اشعار میں ضرور کرتا۔''

اور یہ جملہ بھی:

> ''1599ء میں انارکلی کے زندہ درگور ہوجانے کے بعد جہانگیر نے نہ صرف اپنی بیٹی کا نام نادرہ بیگم رکھا بلکہ اپنے دو بیٹوں شاہجہاں اور شہزادہ پرویز کی بیٹیوں کا نام بھی نادرہ بیگم رکھا۔''

حیرت زدہ معلومات اور دلچسپ انکشافات کی وجہ سے دلچسپی ضرور قایم رہتی ہے اور یہ بھی تاثر بنتا ہے کہ مصنف نے غیر معمولی تحقیق اور حوالوں کے بغیر کوئی سچائی پیش نہیں کی ہے اور بھر پور کوشش کی ہے کہ انارکلی کے ضمن میں سچائی سامنے آسکے اس میں وہ پورے طور پر کامیاب بھی ہیں لیکن سوال ہنوز قایم رہتا ہے کہ یہ

سب کہ سب دائرہ فن میں آتا ہے کہ نہیں، قصہ ناول، اور تحقیق تخلیق بنتے ہیں کہ نہیں؟ یہ بھی دلچسپ ہے کہ ایک مردہ کردار مرکز میں رہتے ہوئے بغیر ایک مکالمہ بولے ہوئے پورے ناول میں چھایا ہوا ہے۔ مکالمے تو صرف انھیں کے ہیں جو انارکلی کی اسکرپٹ لکھ رہے ہیں۔ جو فلم بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر طرح کے فنکار ہیں۔ راونڈ ٹیبل بیٹھے ایک دوسرے سے سوالات کرتے ہیں۔ سوال در سوال، جواب در جواب، انھیں سوالات اور جوابوں سے نقل و حرکت پیدا ہوتی ہے۔ حرارت آتی ہے اور یہ قصہ یا قصہ سے متعلق مباحثہ ناول کے قریب پہنچنے لگتا ہے۔ لیکن جلد ہی پھر تفصیلی بیان، اس بار انارکلی کا اصلی نام، وطن اور ہندوستان اس کی آمد کے تذکرے ہوتے ہیں، اور ایک بار پھر دلچسپ معلومات سامنے آتی ہے۔ لیکن معلومات ناول کس طرح بنیں۔ یہ ایک سوال اہم تو ہے ہی لیکن سنبھالا ملتا ہے جب مصنف مغل دربار کی کنیزوں ۔رقاصاؤں نغمہ سراؤں اور ساتھ ہی کتھک، پکھارج، طبلہ وغیرہ کا دلچسپ ذکر کرتا ہے اور پھر یہ جملہ ۔

''یقیناً کم سن نادرہ نے انارکلی کہلانے سے قبل قلعہ لاہور میں کنیزوں سے مخصوص کسی حجرے میں رہ کر کتھک میں مہارت حاصل کی ہوگی۔''

اور پھر اس کم سن اور خوب صورت کنیز سے شہزادہ سلیم سے رشتہ قایم ہوا۔ عرفی شہزادی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''عرفی شیرازی کے اشعار سے ثابت ہے کہ ان باندیوں کے باوجود بائیس سالہ شہزادہ سلیم کا شاہی حرم کی پندرہ سالہ مقرب کنیز، انارکلی سے تعلق 1591ء میں قایم ہوا اور نومبر 1594ء میں وہ انارکلی کی خواب گاہ سے پکڑا گیا۔''

نیز سلطنت طاقت اور اقتدار کے داؤں پیچ بھی سامنے آتے ہیں جہاں بیٹا باپ کا نہیں ہوتا اور بھائی بھائی کا نہیں۔ ایک خیال ہے کہ بادشاہ اکبر کو زہر دینے کی کوشش کی گئی اور شک گیا بیٹے سلیم پر۔ شدت درد میں اکبر چیختا تھا اور کہتا تھا کہ ''بابا شیخو! ساری سلطنت تمھاری تھی پھر ہماری جان کیوں لی؟'' یہ جملے بھی راوی کے ذریعہ ادا ہوتے ہیں اصل کردار کے نہیں لیکن آگے پیچھے کے واقعات کو جس ڈرامائی کیفیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اس سے ایک متاثر کن فضا تو بنتی ہی ہے۔ سلیم انارکلی کی خواب گاہ میں پکڑے گئے۔ یہی وجہ بنتی ہے باپ بیٹے میں تکرار کی۔ انارکلی دیوار میں چنوا دی گئی۔ عرفی شیرازہ کے یہاں اشارے ملتے ہیں چنانچہ عرفی کو زہر دے دیا گیا۔ ابوالفضل کا قتل ہوا اور پھر کہانی در کہانی پھیلتی چلی گئی۔ ان سب واقعات کی تفصیل اور تحقیق۔ حوالے اور اشارے سبھی کچھ موجود ہیں جو دلچسپ تو ہیں اور مصنف کی غیر معمولی تلاش اور تحقیق کا پتہ دیتے ہیں لیکن غیر معمولی تخلیق کی تشکیل کا نہیں۔ بہر حال جو کچھ کہ ہے عمدہ اور غور طلب ہے۔ یہ جملے کس قدر چونکاتے ہیں۔

''انارکلی ایک کنیز تھی نہ رہی لیکن اسی دن سے اکبر کا زوال شروع ہوا۔'' انارکلی اکبر اور سلیم کے لیے محض ایک کھلونا تھی۔''

''انارکلی جیسا کہ گنبد گواہی دے رہا ہے کہ یہاں انارکلی دفن ہے اور کوئی نہیں۔ ''عرش آستانی نے اسے ایک نام دیا تھا۔ انارکلی لیکن اس نام سے نوازنے کے بعد اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔''

اور پھر ایک مقام پر یہ بھی۔

''عہد انگلشیہ میں جب اس مقبرہ کو جنوری 1852ء میں سینٹ جیمز چرچ کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ ہوا تو قبر کھود کر انارکلی کے استخوان کو مقبرہ ہی کے ایک بغلی برج میں دفنا دیا گیا لیکن کس برجی میں؟ مقبرے کی برجیاں تو بہت سی ہیں۔ انارکلی کے نئے مدفن کی واضح نشاندہی نہ ہونے کی وجہ سے ہی لوگوں کو نت نئی کہانیاں تراشنے کا موقع مل گیا۔ سوال یہ ہے کہ انارکلی کا جسد خاکی اس وقت ہے کہاں....؟''

اور پھر یہ بھی۔

''انارکلی کی بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ اسے مسلسل در بدر اور بے

نشان رکھ گیا۔ بے شک 1599ء میں اس کے زندہ درگور ہوجانے کے سات سال بعد جہانگیر نے اس کا جسد خاکی لاہور کے قلعہ سے نکال کر یہاں دفن کروایا۔لیکن انارکلی کو مدفن کب نصیب ہوا؟''

اور پھر C Gray کا انگریزی میں لکھا ہوا مضمون The Story of Anarkali اپریل 1934ء کے Journal of the Punjab University Historical Society کی روشنی میں یہ نتیجہ خیز بات۔

''C.Gray کے مضمون کی روشنی میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ انارکلی کا جسد خاکی اب بھی مقبرہ انارکلی کے صدر دروازے سے ملحقہ بائیں برجی کے نیچے دفن ہے جہاں اسے 1852ء میں دفنایا گیا۔''

کانفرنس ہال کا سناٹا۔ سبھی سننے والوں کی ہیبت، اور ایک اہم فیصلہ، کہ انارکلی کو اسی مقبرے کے عین گنبد کے نیچے پھر سے دفنایا جائے اور احتجاجی آواز اور فیصلہ ''ہم کریں گے یہ کام'' بے شک ہم کریں گے We will do that together

اور یہ نتیجہ

''انارکلی سے متعلق بے سراپا باتیں رد ہوئیں۔ سارا منظر نامہ صاف ہوگیا ایسا کیوں نا ہوتا۔ تاریخ اور آثار قدیمہ کے عالم بات کر رہے تھے۔ یہ تو ہونا ہی تھا''

اور پھر ملال اور جلال کا ایک فیصلہ ابھرتا ہے۔ ''آج ہی کی رات یا پھر کبھی نہیں''

ناول کا ایک حصہ یہیں پر ختم ہوتا ہے۔ کمزور اور جلد باز قسم کا ناول نگار ناول کو اسی مقام پر ختم کر سکتا تھا لیکن مرزا حامد بیگ کے مضبوط قلم کے ذریعہ وہ آگے کا سفر طے کرتا ہے۔ انارکلی پر فلم بنانے والوں کی خوشی جوش و جذبہ اصل انارکلی کی اصل حقیقتیں سامنے لانے کے لیے بیتاب ہوتی رہیں اور ناول کا دوسرا حصہ انھیں جذبوں اور جملوں سے شروع ہوتا ہے۔

''جس طرح شہزادہ سلیم کا دماغ باغیانہ خیالات کی آماجگاہ بنتا چلا گیا وہی حال ہمارا ہے..... یلغار ہو!''

اسی تسلسل میں دو ایک سوال اور جاگے

''شہزادہ سلیم بارہ گاہ اکبری میں حد ادب سے بڑھا تو کیوں؟ اکبر کے سفر کشمیر کے دوران راجوڑی کے مقام پر کیا ہوا؟ قلعہ لاہور سے اکبر کا محل اور محل سے متعلقہ حرم سرا جیسی اہم عمارات کیسے نیست و نابود ہوگئیں؟''

ان تمام سوالوں اور جوابوں کے مرکز میں اب لاہور ہے اور فلم کی تیاری ہے۔ پورا یونٹ موجود ہے۔ لاہور کا جغرافیہ، تاریخ، اور قلعہ لاہور، جس میں 1587ء میں ایک کم سن نادرہ راجہ مان سنگھ کے ساتھ داخل ہوئی اور بارہ سال کے بعد یعنی نومبر 1599ء کو اسی قلعہ میں چنوا دی گئی۔ اور بھی بہت کچھ ہوا۔ قلعہ کے دروازوں، دیواروں، عبادت خانوں، اسلحہ خانوں، کنوؤں، خیموں وغیرہ کا ذکر ملتا ہے اور ناول تھوڑی دیر کے لیے آثار قدیمہ میں گم ہو جاتی ہے اور ناول قدیم آثار کے سنگ سرخ اور سنگ مرمر میں سانس لینے لگتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کو بیان کرنے والے آج کے کردار ہیں۔ انارکلی سے لاہور سے تاریخ سے محبت کرنے والے محبت کے قدر داں، محبت دین و ایمان چنانچہ ان کرداروں کے مابین محبت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اُدھر اکبر اور ان کی بیگمات کا سفر ادھر سنی اور مدیحہ کا سفر، ادھر غلام علی خاں، ادھر فتح علی خاں، ان سب سے اوپر تان سین، دھرپد، غرض بہت سارے اذکار سے، فلم کی تیاریوں مصروف ہوتا ناول سفر کرتا ہے اور کے آصف کی فلم مغل اعظم تک پہنچتا ہے اور نئی فلم ان سارے تجربات کا فائدہ اٹھائے گی۔ ابھی اس ناول میں اکبر کی محافل شبینہ کا ذکر باقی ہے۔ جس سے فلم رات کے اندھیرے میں چمکتی ہے۔ موسیقی، راگ راگنی اور اس ضمن میں تحقیق کے کچھ نئے اشارے جیسے۔

''بے شک تان سین آگرہ کے قلعے میں گاتا رہا لیکن وہ 1588ء میں سورگ باش ہو گیا تھا۔ اسے ہم 1591ء تا 1599ء کے قصہ لاہور میں نہیں دکھا سکتے۔ کے آصف نے مغل آصف میں کیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کم علمی بڑے بڑے گل کھلاتی ہے۔ اسی طرح فلم بیجو باورا میں بلا تحقیق تان سین اور بیجو کی گایکی مقابلہ کروا دینا کتنی مضحکہ خیز بات تھی۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں بیجو کو دربار اکبر سے متعلق نہیں بتایا۔ بجے نانو عرف بیجو قدرے بعدہ گایک ہے''۔

غرض کہ اکبر، متعلقین اکبر، شہزادہ سلیم، انارکلی، لاہور اور قلعہ لاہور سے متعلق اب تک جتنی بھی غلط فہمیاں، سچے جھوٹے قصے کہانیاں مشہور ہوئے اس ناول میں پوری تحقیق کے ساتھ ان کی سچا بیان تخلیقی پیرائے میں ملتا ہے جو بیحد دلچسپ اور معلوماتی ہے اور کرشماتی انداز میں ناول کے پیرائے میں پیش کرنے کی جدت طرازی بھی جس کے لیے ناول نگار کی اصل تحقیق محنت کے ساتھ ساتھ تخلیقی بصیرت کام کرتی دکھائی دیتی ہے۔ تحقیق کو تخلیق میں خلق کرنا آسان کام نہیں اس لیے اکثر ناول نگاروں نے ماضی بعید کے ایسے ہی موضوعات کا انتخاب کیا ہے جہاں تخیل کے کھل کھیلنے کا راستہ آسان ہو اور ناول کی تخلیقی فضا تاریخ سے زیادہ رومان سے سرشار ہو لیکن انارکلی جیسے مشہور زمانہ کردار، عاشقانہ قصہ کو جو عرفی شیرازی اور شاہ حسین کے کلام کے ذریعہ گلی کوچہ اور بازار تک پہنچے گئے ہوں اور سیکڑوں قسم کے غلط صحیح واقعات، روایات قایم ہو چکی ہیں۔ سیکڑوں کتابیں، ڈرامے اور فلم بن چکی ہوں اور سب میں کچھ نہ کچھ تاریخی قسم کی غلطیاں بھی سرزد ہو چکی ہوں اس پامال موضوع کو از سر نو ایک نئے پیرائے میں پیش کرنا، صرف واقعات کی سچائی تلاش کرنے تک محدود نہیں ہے بلکہ مغل بادشاہوں کے شاہانہ طور طریقے، باپ بیٹے کے رشتے، حرم کی عورتیں، کنیزیں، رقص و نغمہ، موسیقی وغیرہ ایک تاریخ ہی نہیں ایک تہذیب کی تلاش بھی ہے تہذیبِ بادشاہی نہیں بلکہ تہذیبِ زندگی بھی اور اس سے زیادہ تہذیبِ عاشقی، ناول نگار نے تو حقوق انسانی کا نکتہ بھی اٹھایا اور یہ بھی کہ کون کون دشمنان عشق ہوئے انھیں سر بازار رسوا کرنے کا ارادہ اور جذبہ بھی یہ جملہ دیکھئے۔

''اوہ! پھر تو شاہ حسین ہوں گے صاحب۔ کیوں نا بازار میں دکھانا پڑے انھیں علامتی صوفی کے طور پر داڑھی منڈوا کر سرخ چولا پہنے بازار میں رقص کر کے اپنے عقیدت مندوں سے جان چھڑاتے ہوئے۔''

غرض کہ ناول گذشتہ تمام سچائیو اور کمزوریوں کو گرفت میں لیتے ہوئے ایک نئی انارکلی اور سلیم کو پیش کرتا ہے۔ اسی طرح لاہور اور قلعہ لاہور کو بھی۔ یہاں تک کہ اس کے در و دیوار کو بھی تاریخ اور تہذیب کو بھی، پھر بھی یہ تاریخی ناول نہیں ہے۔ شاہدا سے تحقیق کی رو سے دستاویزی ناول کہا جائے بہر حال ناول کے موضوع میں ایک تازگی کا لطیف و شدید احساس ہوتا ہے اور تازگی اس وقت اور خوشبو دینے لگتی ہے جب پوری ٹیم میں محنت کے ساتھ ساتھ محبت کی کلیاں کھلنے لگتی ہیں خواہ وہ انارکلی کی کلی ہو یا نہ ہو۔ کلی خواہ وہ کل کی ہو یا آج انار کی ہو یا گلاب کی۔ کلی تو اچھی لگتی ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ ناول نگار نے ان کلیوں کی خوشبو کو برقرار رکھا ہے اور خوشبو تو کرداروں میں ہوتی ہے وہ تو محبت سے پر جملوں میں بھی رچ بس جاتی ہے جو اس ناول میں نظر آتے ہیں۔

تحقیق مکمل ہوئی اور تیاری بھی مکمل تو ٹیم واپس ہونے لگی۔ ایک نئے جذبہ و شعور کے ساتھ لیکن شہریار مرزا غائب یعنی ٹیم کا شہزادہ غائب، شہزادہ تاریخ میں بھی غائب، یہ گمشدگی کیا ہے، تلاش جاری، جواب ملا، وہ ایسا ہی الٹے دماغ کا ہے، شہزادہ سلیم بھی الٹے دماغ کا تھا۔ یا اسے گہرے عشق نے جنون میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ اپنے طاقتور باپ مغل اعظم سے ٹکرا گیا۔ عشق کا جنون ہوتا ہی ایسا ہے۔ کل بھی اور آج بھی لیکن ایسا ہی عشق زندہ رہتا ہے کل

بھی اور آج بھی۔ تبھی تو ہمارے شعراء نے عشق کے باب میں کیا کیا زندۂ جاوید شعر کہے ہیں۔

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی ہو کیا مجازی کا

(ولی)

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آیا

(میر)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

(اقبال)

عشق میں کہتے ہو حیران ہوئے جاتے ہیں
یہ نہیں کہتے کہ انسان ہوئے جاتے ہیں

(جوش)

حاصل حسن و عشق بس ہے یہی
آدمی آدمی کو پہچانے

(فراق)

یہ اشعار یونہی ذہن میں آ گئے ورنہ اس سے بہتر بھی اشعار ہیں۔ انگریزی ادیب ٹینی سن نے کہا تھا کہ

''محبت کرنا اور ناکام رہنا بہتر ہے محبت نہ کرنے سے''

ایڈورڈ کارپینٹر نے کیا اچھی بات کہی ہے۔

''جس شخص نے محبت کے المیہ کا احساس کیا ہے وہ اپنے کو دیوتا سمجھنے میں حق بجانب ہے''۔

شہزادہ سلیم کا عشق ان تمام درجات اور مشکلات سے گزرا ہے۔ اسی لیے اس میں ناکامی کے باوجود کامیابی ہے اور المیہ میں زندگی کی توانائی ہے۔ ناول کا آخری حصہ، بالکل آج کا یعنی 2017ء کا، ستائیس سال گزر گئے اس ناول کو لکھنے میں جیسا کہ لکھا ہے انارکلی دستاویزی ناول، زمانہ تحریر 27/ مارچ 1986ء تا جون 2017ء اسلام آباد اور برلن درمیان میں آ گئے۔ تمام احباب بکھر گئے۔ زمانہ بدل گیا۔ بس یادیں رہ گئیں۔ محبت کی یادیں کہ محبت ہی زندہ رہتی ہے۔ کل بھی اور آج بھی کسی شاعر نے فرہاد کی زبانی کہا ہے۔

ہزاروں رنگ بدلے گا زمانہ
زمانہ بھی بدلے گا محبت کا فسانہ

فرہاد کی بات صد فی صد درست اس لیے اس کی محبت زندہ ہے۔ انارکلی اور سلیم کی محبت بھی زندہ ہے۔ انارکلی زندہ ہے۔ اس کی موت میں زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر ڈرامے لکھے جا رہے ہیں فلمیں بنائی گئیں اور اب یہ ناول ایک نئی تکنیک میں ایک نئی زندہ تحقیق کے ساتھ۔ جسے تاریخی ناول کہنا تو مشکل ہے اور جسے پورے طور پر رومانی یا عشقیہ ناول بھی کہنا مشکل ہوگا۔ مصنف نے خود تو اسے دستاویزی ناول کہا ہے جو ایک نیا نام ہے۔ یوں تو ہر ناول ایک تاریخی اور سماجی دستاویز ہوتا ہے لیکن مرزا حامد بیگ نے اسے واقعی ایک سچی، پختہ دستاویز بنا کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور انھیں یہ کرنا ہی چاہیے تھا کہ وہ لاہور کے باشندہ ہیں لاہور اور قلعہ لاہور سے انھیں لگاؤ ہے اور ان دونوں کے درمیان آتی ہے انارکلی۔ ایک رائٹر کو اس کی زندگی سے زیادہ اس کی موت سے پیار ہے۔ اس لیے اس کی موت پورے ناول میں زندگی بن کر دوڑ رہی ہے۔ یہی ناول کی کامیابی ہے۔ مرزا حامد بیگ کی تیس سال کی محنت شاقہ کے پھول کھل اٹھے۔ انارکلی جاگ گئی اور اردو دنیا کو ایک پختہ و بالیدہ و روشن ناول مل گیا جو آنے والی انار کی کلیوں کو راستہ دکھاتا رہے گا اور اس کا ہر قاری اپنے آپ کو شہزادہ سمجھتا رہے گا۔ فراق گورکھپوری کے ان جملوں پر اپنی گفتگو تمام کرتا ہوں۔

''محبت دنیا سے آنکھ نہیں چراتی۔ عمل سے منھ نہیں موڑتی۔ عشق اور جذبۂ عشق بہ یک وقت آہ ہے تو للکار بھی۔ دعوتِ عشق ہے تو دعوتِ عمل بھی۔'' (اردو کی عشقیہ شاعری)

اسود گوہر

مضمون

تلک الایام ۔۔۔نورالحسنین کا نیا ناول

' تلک الایام' جیسا ناول جب میرے سامنے آیا اور میرے مطالعے کا حصہ بنا تو میں ششدر رہ گئی کہ اسے کس زمرے میں شمار کروں، یہ ماضی کی بازیافت ہے یا حال کا آئینہ، یہ سوانح ہے یا ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب کے وہ بکھرے اوراق ہیں جنھیں ویدوں، پُرانوں، سے سمیٹا گیا، جن میں فنون لطیفہ کے خزانوں سے راگ راگنیوں، موسیقی، ادب، رقص کے ماخذوں کو ڈھونڈھا گیا، جن میں سنتوں اور صوفیوں کے مٹھوں اور خانقاہوں سے انسانیت کے اُس عطر کو کشید کیا گیا جس کی آج بھی ضرورت ہے۔ یہ عہد آصفیہ کے اختتام اور پولیس ایکشن کا گواہ بھی ہے، موجودہ جمہوری نظام بھی ہے اور اس نظام میں آج مسلمانوں کی کیا حالت ہے اس کا اظہار بھی ہے، ساتھ ہی اس میں موجودہ نظام حکومت اور جمہوریت کے لیے وہ سبق بھی ہے جو پھر سے ایک بار رام راجیہ اور خلفائے راشدین کے دور کو زندہ کر سکے۔ یہ تاریخ کا مطالعہ ہے یا تہذیب وتمدن کی یاداشتیں ہیں؟ اور اگر یہ سب ہیں تو کیا یہ ناول بھی ہے ؟ اس کا جواب ناول نگار کا فن دیتا ہے کہ یقیناً یہ ایک عمدہ ناول بھی ہے، کیونکہ اس میں ان سب کے باوجود ناول کے فن کو کہیں بھی مجروح نہیں ہونے دیا گیا ہے۔ اس میں زندگی بھی ہے۔ زندگی کا منظر نامہ بھی، زندگی کے کردار بھی ہیں، ازدوجی زندگی کے شب و روز بھی ہیں۔ یہاں بیوی محبوبہ بھی ہے ۔دوست بھی ہے۔ محافظ بھی ہے اور نگراں بھی۔ محبت کی مٹھاس بھی ہے اور آپسی چھیڑ چھاڑ بھی، رومان بھی اور حالات کی تلخیاں بھی ہیں، مسرتوں کی شادمانیاں بھی ہیں، تضاد اور تصادم کی تصویریں بھی ہیں، آر ایس ایس اور تنگ نظر جماعتوں کے منصوبے بھی ہیں تو فراغ دل ہندو بھی ہیں، تعصب اور گھٹن کی عکاسی ہے تو گنگا جمنی تہذیب کی روائتیں بھی ہیں، کچھ خواب بھی ہیں اور اُن کی تعبیریں بھی ہیں۔ ساتھ ہی اُن کے خاندان کے بزرگوں کا 'خجند' سے لاہور پہنچنا اور وہاں سے دکن کی سرزمین کو آباد کرنا ہے، ان سب کو سمیٹنا اتنا آسان نہیں تھا، لیکن کمال تو یہی ہے کہ ان سب کے امتزاج نے ناول کے کینوس کو وسیع ہی نہیں کیا بلکہ انفرادیت کی وہ سند بخش دی جو اُس کا حق ہے۔

نورالحسنین کا یہ ناول ' تلک الایام' اُن کے عمیق مطالعے، اُن کی معاشرتی وسماجی تہذیبی نظر اور فن پر مضبوط گرفت کی دین ہے۔ اس ناول کا سب سے بڑا کمال اس کا مطالعاتی وصف ہے۔ یا پھر اس کا تجسس، جو قاری کو بے تھکان تین سو صفحات پڑھوا لیتا ہے۔ ناول میں اصل موضوع کے ساتھ کئی مسائل اس طرح در آتے ہیں گویا کسی تناور درخت کی جڑیں اندر ہی اندر پھیلتی جا رہی ہیں اور اُن کی بنیاد ہی پر ہی پیڑ سرسبز وشاداب ہو گیا ہے۔ ایک عرصے کے بعد اُردو قارئین کے مطالعے میں ایک ایسا ناول آیا ہے جس کی روشنی میں پورا ہندوستان سانسیں لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے، اور مطالعاتی وصف ایسا کہ قاری سے پڑھوا کر ہی دم لیتا ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار جو ایک ادیب بھی ہے، کچھ مہینوں سے عجیب سی اُلجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اُسے عجیب سے مناظر نظر آنے لگتے ہیں۔ کبھی وہ صدیوں پرانے انسانوں کو اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھتا ہے۔ کبھی وہ اُس سے باتیں کرتے ہیں۔ پہلے تو وہ اور اُس کی بیوی سمجھتے ہیں کہ شاید یہ مسلسل مطالعے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ وہ اُسے پڑھنے لکھنے سے منع کرتی ہے۔ اُس کی لائبریری میں سے تصوف کی ساری کتابیں ہٹا دیتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی کوئی افاقہ نہیں ہوتا تو وہ اُسے ڈاکٹروں کے حوالے کرتی

ہے۔اُس کے دماغ کے مختلف ٹیسٹ ہوتے ہیں اور رپورٹ نارمل آتی ہے تو وہ اُسے ماہرین نفسیات کے پاس لے جاتی ہے۔وہ بتاتا ہے کہ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے، شائزو فرینیا Schizophrenia جس میں مریض نہ صرف عجیب وغریب چہرے دیکھتا ہے بلکہ اُسے اُن کی باتیں بھی سنائی دیتی ہے اور وہ بھی اُن سے باتیں کرتا ہے۔یہی وہ مرض ہے جس کی وجہ سے وہ انوکھے خواب دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اپنے خاندان کے بزرگوں سے مل رہا ہے۔وہ ان خوابوں کو حقیقت سمجھتا ہے جبکہ اُس کی بیوی یاسمین اُس کی ان باتوں کو رد کرتی ہے اور اُس کے علاج پر زور دیتی ہے لیکن وہ اسے بیماری تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار ہی کرتا رہتا ہے۔

نورالحسنین نے ناول کی بنت پر خصوصی توجہ دی ہے۔ زماں ومکاں کے فرق کو واضح کرنے کے لیے اسلوب اور زبان کے تجربے بھی کیے،ایسے تجربے جن سے اُن کی ذہانت، ہوشمندی ،فکر اور محنت کا اندازا ہوتا ہے۔خجندی بزرگوں کی زبان عربی تھی یا ایران کی قربت کے باعث وہ فارسی جانتے تھے۔اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اُنھوں نے اُن کے لیے صحیفوں کے ترجمے کی زبان کو استعمال کیا جس کے باعث قاری ایک نئے انبساط سے سرشار ہوتا ہے۔اس سلسلے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

'' حضرت سید شاہ ظہیر الدین نے میری طرف پھر ایک بار اُن ہی میٹھی نظروں سے دیکھا،اور کہنے لگے،'' سبھی علم ہیں اُسی کے، کہ وہ جانتا ہے کس کو دیا جائے اپنے خزانے سے کتنا، لیکن جانتا ہوں جو میں، بتاتا ہوں تجھ کو، سُن اے ابن سیدی۔۔۔جس پہلی وحی میں ذکر تھا قلم کا، وہ دیا تھا رسول مقدس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علی کرم اللہ وجیہ کو، اور اُنھوں نے کیا تھا حوالے اُسے حسین شہید کربلا کو، اور بخشا اُنھوں نے امامین کو، اور ہوتا ہوا اُن سے خواجہ خواجگان خواجہ حسن بصری کو، اور وہی قلم گزرتا ہوا کئی واسطوں سے پہنچا مجھ تک، کہ تو میری ذریت ہے، اب کرتا ہوں اسے حوالے تیرے۔۔۔لکھ وہ سب کچھ کہ جو دیکھتا ہے اپنی کھلی آنکھوں سے، خواب ناک آنکھوں سے، اپنے تصور کی آنکھوں سے۔''

لیکن جب بھی وہ اس بیماری کے اثر سے باہر ہوتا ہے تو بالکل نارمل زندگی بسر کرتا اور عصری مسائل سے پوری طرح باخبر ہوتا ہے۔اُس کا بڑا بیٹا سلطان سیاست میں دلچسپی لیتا ہے وہ اُسے بالکل پسند نہیں ہے اور جب کبھی گھر میں بیٹا اس قسم کی باتیں کرتا ہے ،وہ اُس کی باتوں کو رد کرتا رہتا ہے۔ایسے ایک روز باپ بیٹے سے سوال کرتا ہے:

'' کیا بات ہے سلطان ! آج تمہارے چہرے پر بڑی تازگی دکھائی دے رہی ہے؟''

'' مسلمانوں کی شک کی بنیادوں پر ہونے والی گرفتاریوں کے خلاف ہم لوگ ایک بڑا لیکن خاموش جلوس نکالنے والے ہیں۔''

'' تم کیا سمجھتے ہو بیٹے اس احتجاج سے یہ ظلم رُک جائے گا؟'' باپ نے بیٹے سے سوال کیا ۔

'' بابا ہمارا کام ہے اس کے خلاف آواز بلند کریں۔''

'' دیکھ لو یہ بھی کر کے۔۔۔!'' وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے،''مسلمانوں کی اب سنتا کون ہے؟''

'' اس جلوس میں دیگر قوموں کی سیکولر

جماعتیں بھی شرکت کرنے والی ہیں۔''

'' بیٹے اس سلسلے میں میں تمہارے حق میں صرف دعائیں ہی کرسکتا ہوں۔''

'' آپ ایسی نا اُمیدی کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔'' یاسمین کی زبان سے نکلا،'' اللہ بھی تو دیکھ رہا ہے؟''

اُن کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ اُبھری،'' بیگم۔۔۔اللہ نے مسلمانوں کی طرف سے آنکھیں موندلیں ہیں۔ساری دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہورہا ہے۔۔۔؟ یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔''

''اب آپ مسلمانوں کے اعمال پر ایک بڑا سا لکچر دیں گے۔'' یاسمین کے تیور بدل گئے۔

''میرے لکچر سے کیا ہوگا۔۔۔؟'' وہ اپنی جگہ سے اُٹھ گئے اور اپنے رائٹنگ ٹیبل کی طرف جانے لگے تھے،''مسلمان اگر حصولِ علم کے اپنے منصب کو سمجھتے تو کم از کم آج یہ دن دیکھنے کی نوبت نہ آتی۔''

' تلک الایام' کے پیڑ کی ٹہنیوں پر ایسے کتنے ہی سوالات ہیں جو جواب مانگتے ہیں، گئو رکھشا کے نام پر انسانی قتل، غریب بچوں کا اسکولوں سے ڈراپ آوٹ ہونے کا سبب، مذہب کے نام پر ہونے والی تنگ نظری، دنگا فساد، الیکشن کے موقعوں پر غریب عوام سے مٹی کے مول ووٹوں کی خریداری، ادب صرف مسائلی کیوں؟ دہشت پسندی، فاشیزم، لا قانونیت، انتشار، تنگ نظری جیسے حالات کے باوجود ترقی پسند جیسی کسی تحریک کا خیال دانشوروں کے ذہن میں کیوں نہیں آتا؟ ساری زبانوں کے ادیب متحد کیوں نہیں؟ کیا مسلمان حکومت کی مدد کے بغیر اپنی زبان اور قوم کا مستقبل نہیں سنوار سکتے؟ صدیوں تک انسانیت اور دینِ حق کا پیغام دینے والی خانقاہیں آج خاموش کیوں؟ ایسے کتنے ہی سوالات ہیں جس کا جواب ناول'' تلک الایام'' اپنے قارئین سے دریافت کرتا ہے۔

ان سب کے باجود بھی ناول میں رنگینیاں بھی ہیں ،مستقبل کے سہانے خواب بھی ہیں۔کچھ کرنے اور کچھ پانے کا حوصلہ بھی ہے۔حسین اور یاسمین کی شادی سے پہلے کا ایک منظر ملاحظہ فرمائیں:

'' اُس وقت میں بی۔اے کا طالب علم تھا اور میرے افسانے ملک کے بہت سارے اہم رسائل میں شائع ہونے لگے تھے۔ہم دونوں بارہ دری کے پاس سیاحوں کا ہجوم دیکھ کر مغربی حصے کی طرف چلے آئے تھے اور کلے کی مسجد کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھ گئے تھے۔دھانی رنگ کا دوپٹہ اُس کے آدھے سر سے پیروں تک جھول رہا تھا۔وہ مقبرے کے بلند مینار کے گنبد کو دیکھ رہی تھی۔میں نے اُس کے کانوں میں سرگوشی کی،'' اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہو؟''

اُس نے اپنی نظریں کچھ اور اوپر اُٹھائیں،'' میں ادب کے سب سے اونچے مینار پر آپ کا نام دیکھنا چاہتی ہوں۔''

میرے چہرے پر اُس کی اس نادان خواہش کو سن کر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور منہ سے نکلا،''پگلی۔۔۔میرا نام زمین سے کچھ اوپر ہی اُٹھ جائے تو یہی میرے حق میں بہت کچھ ہوگا۔''

اُس نے ایک دم میری طرف دیکھا،'' آپ

کے پیش رو بھی تو کبھی زمین ہی پر تھے۔ پھر وہ کیسے آسمانِ ادب کے روشن ستارے بن گئے؟ ''

'' اُن کی محنت۔ اُن کا مطالعہ۔ اُن کا مشاہدہ اور اُن کی بے پناہ صلاحیتیں۔'' میں پیروں کے نیچے لیٹی ہوئی زمین کو دیکھنے لگا تھا۔

اُس نے کلمے کی اُنگلی سے میری تھوڑی کو اوپر اُٹھایا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگی،'' ان منازل کو تو آپ بھی سر کر سکتے ہیں، اب رہی بات صلاحیت کی تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ آپ میں بے پناہ صلاحیتیں ہیں۔ اُنھیں استعمال میں لائیں، وہ کہانیاں لکھیں جو آپ کو بھیڑ کا حصہ نہیں بلکہ انفرادیت کے مینار کی سیڑھیوں کی طرف لے جائیں۔''

میری آنکھیں اُس کی آنکھوں میں اُتر گئیں، چہرے پر اطمینان کی خوشی گُد گُدیاں کرنے لگیں تھی اور حوصلہ میرے لبوں پر کسی پھول کی طرح کھلنے لگا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے کندھوں پر پھیلا دیئے،'' تم اگر میری پشت پر اسی طرح کھڑی رہوگی تو میں نام و شہرت کے وہ سارے ستارے جو بہت دور نظر آتے ہیں ایک

ایک کرکے تمہارے
قدموں میں ڈال دوں گا
۔'' وہ بے اختیار میرے
سینے سے لگ گئی۔''

اگر یہ اقتباس نورالحسنین کی سوانح سے متعلق ہے تو بلا شبہ کہا جاسکتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی محبوبہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دکھایا نورالحسنین کے بارے میں یہ بات بھی بہت مشہور ہے کہ وہ اسٹیج اور ریڈیو پر رومانی و جذباتی سین نہایت عمدگی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ اسی لیے یہ خوبی اُن کی تحریر کا بھی حصہ بن گئی۔ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ناول کے رومانی مناظر سے کچھ جھلکیاں پیش کی جاتی، لیکن مشکل تو یہی ہے کہ ناول کی کس کس خوبی کے اقتباسات سے دامن بھرا جائے۔ نورالحسنین اسی ناول کے وسیلے سے الیکشن کے بعد ہونے بعد حالات اور عوامی بے حسی اور انتظامیہ کی بدانتظامی پر بھی احتجاج کرتے ہیں:

'' الیکشن میں کیے گئے وہ سارے وعدے عوام کو منہ چڑھا رہے ہیں۔

وزیراعظم ان ہی پانچ برسوں میں ساری دنیا کو دیکھ لینا چاہتے ہیں۔

مہنگائی دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔

پندھرا لاکھ کی آس میں غریبوں کی دن رات کی محنت کے سو روپے بھی بنک کے نذر ہوگئے۔ غریبوں کی اس کمائی سے کنگال ہونے والے بنکوں کی بھرپائی ہوگئی، جنھوں نے سیاسی بیوپاریوں کو کروڑہا روپیہ لون کی صورت دیا تھا۔

ہندو تنظیمیں کتنے ہی دیہاتوں سے مسلمانوں کو بے گھر کررہی ہیں اور وزیراعظم مغربی ممالک میں دعوتیں اُڑا رہے ہیں۔

گئو رکشا کی آڑ میں مسلمانوں کو قتل کیا جارہا ہے

۔ قانون اور ملک کے محافظ کی زبان اور آنکھیں بند ہیں۔''

ملک کی دوسری بڑی اکثیریت مسلمانوں کی حالت زار آج وہی ہوکر رہ گئی ہے جو کبھی رومن بادشاہوں کے عہد میں یہودیوں کی تھی۔ یہ وہ قوم تھی جس سے کبھی قیصر و کسریٰ کے ایوان کانپتے تھے۔ جس نے دنیا پر حکومت کی تھی اور آج اُن کی حالت پس

ماندہ اقوام سے بھی بدتر ہوگئی، آخر اس کے اسباب کیا ہیں؟ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ''تلک الایام '' میں اس کا بھی جواب ہے:

'' آسمان کی طرف مت دیکھو ۔۔۔تم ہی زمین کے ذمہ دار ہو۔۔۔تم بھول گئے ہو کہ زمین کی خلافت اُس نے تمہارے حوالے کی ہے ۔تم کو سوجھ بوجھ اور عقل کے ہتھیار بھی سونپے تھے ۔تم نے اپنی سوجھ بوجھ اور عقل کو محض دارو کی ایک بوتل، بیوی کے لیے سوتی ساڑی اور چند روپیوں میں پانچ سال کے لیے گروی رکھ دیا۔تم نے خود اپنے اختیارات کا سودا کیا ہے ۔تم نے خود اپنا نصاب بھلا دیا؟ جائزہ لو آج تم کہاں ہو؟ ۔۔۔تم تعلیم میں پیچھے،

سائنس اور تکنالوجی کو طاغوتی علم قرار دینے والے تم، مادیت کے ایسے دیوانے ہوئے کہ تم نے رشتوں کی مٹھاس اور اُس کے تقدس ہی کو فراموش کر دیا؟ اُس نے کہا تھا کہ مجھے نفاق پسند نہیں ہے اور تم جماعتوں میں بٹ گئے ؟ اس لیے اُس نے تمہاری حیثیت وقت کے دھارے کو موڑنے والے سے بدل کر وقت کے مظلوموں میں کر دیا۔اب تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔۔۔؟''

الیکشن کا وقت کیا آتا ہے معروف غیر معروف ملاؤں، مسجد کے پیش اماموں کے وہ تائیدی بیان پڑھنے کو ملتے ہیں جن کی کوئی سیاسی بصیرت نہیں ہوتی، حد یہ کہ اُنھیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کبھی اُنھوں نے ہی اُس کے خلاف نکلنے والے جلوس کی قیادت کی تھی اب وہی کسی نہ کسی پارٹی یا آزاد اُمیدوار کے حق میں ووٹ دینے کا مشورہ دے رہے ہیں، تو دوسری طرف اُن سادھوؤں اور پجاریوں کے بیانات پڑھنے کو اور سننے کو ملتے ہیں جو مذہب کی بنیادوں پر ووٹ دینے کی باتیں کرتے ہیں۔لیکن ملک کا دانشور طبقہ خاموش رہتا ہے۔

'' بابا ۔۔۔ یہی بات میں آپ سے پوچھتا ہوں ۔۔۔آپ لوگ تو دانشور کہلاتے ہیں ۔ آپ لوگ سڑکوں پر کیوں نہیں آتے ؟ کیوں نہیں عام لوگوں کو یہ باتیں سمجھاتے ۔۔۔؟ اس ملک کا کونسا اخبار ہے جو آپ لوگوں کی تحریروں کو نہیں چھاپے گا ؟ لیکن آپ لوگ تو افسانے لکھتے ہیں ، ناول لکھتے ہیں ، شاعری کرتے ہیں ۔۔۔آپ دانشور لوگ اپنے فرائض منصبی سے منہ موڑ رہے ہیں ۔کیا ایسے وقت یہ آپ لوگوں کی ذمہ داری نہیں ہے؟ اور اگر آپ لوگ خاموش تماشائی بنے رہیں گے تو ملک میں اس سے بھی بُرے دن آئیں گے ۔۔۔سن رہے ہیں آپ؟''

دانشور طبقے کی اس لاپرواہی یا عدم دلچسپی نے ملک کی نکیل ایک ایسی راہ کی طرف موڑ دی ہے کہ صدیوں کی تہذب خطرے میں نظر آنے لگی ہے اور ملک کے حساس طبقے کا یہ سوچنا غلط بھی نہیں لگتا:

'' میری نظریں رسائل کی جانب اُٹھتی ہیں ۔اُن کے اداریوں سے درد میں ڈوبے ہوئے الفاظ بلبلاتے ہوئے احتجاج کر رہے تھے ۔شاعری سے خوشبو اور افسانوں سے سکون غائب دکھائی دے رہا تھا ۔ میں نے آنکھیں موندلیں تو جمنا کی لہروں میں تاج محل اور عہد

وسطیٰ کی تاریخ کو ڈوبتے اور لال قلعے کی
عمارت کو زمین بوس ہوتے ہوئے دیکھا اور
سرجو کی وادیوں سے رام چندر جی کو دوبارہ بن
کی طرف لوٹتے ہوئے دیکھا ۔میں نے
گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ۔۔۔اس ملک
سے صدیوں کی تہذیب نہیں مٹ سکتی ۔ وہ
تاریخ جس نے گنگا جمنی
تہذیب کو پروان چڑھایا وہ برباد نہیں ہوسکتی ۔
رام چندر جی اور اُن کے اخلاق و کردار کا درس
یہیں پر اُسی طرح باقی رہے گا۔''

''تلک الایام'' کے اوراق میں کیا کچھ نہیں ہے ہمارا ماضی، ماضی کی شاندار روائتیں، حال کا آئینہ، موجودہ سیاست، اُس کے بدلتے رنگ، ادب اور ہماری ثقافت کی روشن تاریخ، فنون لطیفہ کے بے شمار رنگ، جن کے ڈانڈے ہمیں سام وید تک لے جاتے ہیں ۔سنگ تراشی، موسیقی، راگ و رنگ، رقص اور لئے کی خوبیاں جو روح میں اُتر جاتی ہے ۔ناول کے ایک کردار نیل کنٹھ کوٹھیکر کا یہ سوال :

''حسین کبھی سوچا ہے تم نے، موسیقی سے ہزار
ہا اختلاف کے باوجود چشتیہ سلسلے میں قوالی
کیوں رائج ہے؟''
'' حضرت خواجہ معین الدین چشتی جب
ہندوستان میں پہنچے تو آپ نے دیکھا تھا کہ
یہاں آپس میں مل بیٹھنے کی خاطر رات میں
لوگ بھجن کرتن کرتے ہیں ۔اسی مناسب سے
لوگوں کو
اپنی طرف متوجہ کرنے کی خاطر اُنھوں نے
اپنے مرشد سے اس کی اجازت حاصل کی تھی ۔
''
''نہیں میرے دوست ۔۔۔یہ تو لوگوں نے
ایک جواز پیدا کر لیا ہے ۔حضرت خواجہ معین
الدین چشتی جانتے تھے کہ لئے میں وہ طاقت
ہے جو دل میں اُترتی ہے۔''

نورالحسنین کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ صدیوں پہلے کے بزرگان دین کے ساتھ اُنھوں نے آج کے عصری مسائل پر مکالمہ قائم کیا، یہ بزرگ لاہور سے دکن پہنچتے ہیں تو زبان کے فرق کو واضح کرنے کے لیے وہ دکنی زبان کا استعمال کرتے ہیں ۔جس کی وجہ سے وہ مکالمے بھی دلچسپ ہو جاتے ہیں ۔حسین حضرت عنایت للھی کی خانقاہ میں پہنچتا ہے ۔اُن کے ساتھ ہونے والے مکالمے کے ذریعے نورالحسنین اُجاگر کرتے ہیں کہ موجودہ مسلمان اپنے منصب سے بے گانہ ہوگیا ہے ۔دین کی اصل ڈوری اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی ہے اور وہ مکر، فریب کا بندہ بن گیا ہے ۔ایسی بہت ساری باتوں کے بعد وہ گزارش کرتا ہے کہ مسلمان آج ساری دنیا میں پریشان ہیں اُن کے لیے دعا فرمائیں تو اُسے جواب ملتا ہے:

''تو اول جواب دیجیو میرے سوال کا۔۔۔تیرا
حبیب عارف خورشید یہ
کیا لکھیا ہے۔۔۔؟'' حضرت نے طاق میں
سے ایک رسالہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا،''
اسے پڑھیو''
میں نے دیکھا وہ ایک افسانچہ تھا میں نے
پڑھنا شروع کیا،'' اُس کے بچوں سے سارا
محلّہ پریشان تھا ۔ اُس نے تنگ آ کر اپنے
بچوں کو دینی مدرسے میں ڈال دیا، اب وہ
فارغ ہو کر لوٹے ہیں تو سارا شہر پریشان ہے

۔''

'' بتائیو ۔۔۔اُن کے دینی مدرسے سے فراغت کے بعد سارا شہر پریشان کیوں ہوئیا؟

''حضرت نے میری طرف دیکھا۔''

'' مذہب کی آڑ میں استحصال۔۔۔''

''جب عالماں کا یہ حال ہووے دین سنگ،تو عام آدمی کیا جانے ہے دین اور اُس کے معاملات؟

اس پر بھی تو مجھ سے کہے ہے کہ مسلمانوں کی بہتری کے لیے دعا کریو ۔۔۔؟ مسلمان ہووے تیری دنیا میں۔۔۔؟''

میری گردن جھک گئی۔حضرت کچھ دیر تک اُسی طرح ٹہلتے رہے۔پھر خدا جانے کیا سوچ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔میں اُسی طرح سہما ہوا تھا۔پھر اُنھوں نے میری پیٹھ پر محبت سے ہاتھ پھیرا،'' حسین اپنی قوم تک میرا یہ پیغام بھی پہنچا دیجیو کہ غافل نہ رہیو کہ اللہ نہ بوجے اعمال تمہارے۔وہ پرکھے ہے سات آسمانوں سے تمہارے باسن اور بستر کو۔''

میری آنکھوں میں نہ
جانے ایسے کتنے منظر اُبھر
آئے تھے۔

'' تم دین کو کھلونا کیے،
روبائی اختیار کیے، عالم
بھولیا اپنا فرض، امام بھولیا منبر کا جلال، نمازی
قائم کرے ہے دکھاوے کی نماز، اللہ اور حضور
کے دین کو اپنی سوچ کا دین کیے ہو تم، وہ کب
لگو چھوٹ دیتا، یہ وقت ہووے ہے اُس کے
عتاب کا، اُس کے جلال کا، ھور جلال کو جمال
میں بدلے تک کچھ وقت تو درکار ہووے۔پھر
بھی اُس کے رحم و کرم سے مایوسی کفر ہووے گی
۔ یہ فقیر اپنی ذریت کو آگ کے حوالے نہ
کر دیوں گا ۔دعا ہووے گی اور ضرور ہووے
گی۔''

لیکن اس ناول کی کردار یاسمین جو عمل اور محنت پر یقین رکھتی ہے، اُس کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کی حالت زار دعاؤں سے نہیں اُن کے عمل سے بدلے گی ۔جب تک وہ علم، سائنس اور تکنالوجی سے نہیں جڑیں گے، حالات کا صحیح تجزیہ نہیں کریں گے اور اپنے آپ کو اس قابل نہیں بنائیں گے اُن کے حالات کیسے بدلیں گے؟

یاسمین کے ان خیالات کی تصدیق حسین کے دادا جان عملی طور پر اس طرح کرواتے ہیں:

'' ادھر آؤ۔۔۔سامنے
کی کھڑکی سے باہر دیکھو
۔۔۔''

میں گلمنڈی کی طرف جاتی ہوئی شاہراہ کو دیکھ رہا تھا اور دادا جان کہہ رہے تھے،''جس پر آج تم سندھی افراد کے کپڑوں کی بڑی بڑی دکانیں دیکھتے ہو، یہ وہی سندھی ہیں جو تقسیمِ ملک کے بعد یہاں وارد ہوئے تھے اور سروں پر کپڑوں کی پوٹلیاں لیے گلی گلی آوازیں لگاتے تھے۔اُنھوں نے اپنے وقت کو سمجھ لیا تھا، محنت کی اور آج کپڑوں کے بڑے تاجر بن گئے ہیں ۔اب ذرا نظریں ترچھی کرو ۔۔۔اُس

طرف ۔۔۔ وہاں کبھی تانگہ اسٹینڈ ہوتا تھا ، پولیس ایکشن کے بعد بھی ہماری قوم مریل گھوڑوں سے تانگے ہی ہانکتی رہ گئی اور جو سرکاری ملازمتوں میں تھے اُنھوں نے یا تو نوکریاں چھوڑ دیں ، یا پھر وقت سے پہلے ہی وظیفوں پر علیحدہ ہو گئے ، یا کر دیئے گئے ۔ اُنھوں نے وقت کو سمجھنے کے بجائے اپنے آپ کو وقت کے حوالے کر دیا۔ نتیجہ کیا نکلا ۔۔۔ وہ سب زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ۔ وقت نہ کمزور ہاتھوں کا مربی ہوتا ہے اور نا ہی شکست خوردہ افراد کا حمائتی ۔ خوب سمجھ لو پسرم جس کے عمال اُسے پیچھے ہٹا دیں اُسے حسب نسب آگے نہیں بڑھاتا ۔ اقتدار کی رسی کو تھامنے کے لیے مضبوط ہاتھ ہی نہیں چوکنّا ذہن، انتظامی امور کی اعلیٰ صلاحیت اور مستقبل کو پرکھنے والی آنکھیں بھی چاہیے ہوتی ہیں ۔''

دنیا کے مذاہب میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے دینی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ عصری علوم کے حصول پر بھی زور دیا ہے۔ اور اُن کے لیے قرآن جیسی لاریب کتاب بھی عطا کی ۔ ہم قرآن تو پڑھتے ہیں لیکن اُس کے معنی و مطالب سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ۔

اورنگ آباد دکن میں ولّی اورنگ آبادی کے 43 برسوں کے بعد مولوی سید شاہ قمر الدین نقشبندی کی پیدائش ہوئی ۔ آپ اپنے وقت کے ایک جید عالم اور صوفی تھے ۔ آپ نے اُس خانقاہی نظام کے خلاف آواز اُٹھائی جس نے قرآن پاک کو محض تعویز اور چھو چھا کے ذریعے اپنی روزی کا حصہ بنالیا تھا ۔ آپ نے اورنگ آباد میں ایک ایسا دینی مدرسہ قائم کیا تھا جہاں قرآن فہمی، فقہ، اور حدیث کی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ عصری علوم کی بھی تربیت دی جاتی تھی ۔ آپ قرآن کے پیغام کو سمجھاتے تھے ۔ ناول ''

تلک الایام'' کا مرکزی کردار خواب میں اُن سے بھی ملاقات کرتا ہے تو وہ اُسے اسلام کی تعلیمات اور قرآن کے پیغام سے واقف کرواتے ہیں:

'' اے عزیز القدر پسر ۔۔۔ اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہووے جے مشاہدات ھور تجربات کی بات کرے ہے ۔ قرآن کہیا ۔۔۔ مشاہدہ کرویں آسمانوں ھور زمینوں کا ھور جانیں اُس میں کیا ہووے؟''

'' بے شک ۔۔۔''

'' قرآن مجید حکم دیوے ہے ، اے انسان بوجھ قدرت کے مظاہر زمین ھور آسمانوں کی تخلیق کے اسباب ، موسموں کے تغیر و تبدل کے راز ، ھور دن رات میں کیسے بدلے ، ھور رات دن میں ، غور کرئیو سمندر ، بادلوں ، ہواؤں ، چاند ، سورج ھور ستاروں پر ، پرکھ اُن ضابطوں کو جے پوشیدہ ہووے اُن میں ۔۔۔ غور کرئیو بیماری پر ھور کھول طب کے دروازے ، اے حسین قرآن کی 6666 آیات سوں 756 اے ہی سوال کرے ہے ۔'' میرا منہ حیرت سے کھلا کی کھلا ہی رہ گیا۔

'' ہور سن اے حسین ۔۔۔قرون وسطیٰ کے مسلمانوں نے دوسری زبانوں پر قفل نہیں چڑھائے رہے ۔ وے جانے رہے اُن کی قدر۔ وے جب بھی کسی ملک کو فتح کرے ہے ڈھونڈھے وہاں کی زبانوں کے خزانے ہور اُن کتابوں کو دارالحکومت بھیجے رہے ۔ خلیفہ اُن کے ترجمے کا بندوبست کیے رہتا۔اسی کا نتیجہ ہووے کہ کچھ ہی صدیوں میں اسلامی علوم کے سنگ سنگ ہی سائنسی تحقیق بھی پیرو پنکھ نکالے رہے ہور طب، فلکیات ، کیمیا، معدنیات، ہور نہ جانے کتنی ہی ایجادیں ہو وے جن کے موجد مسلمان رہے ہیں۔''

میں نے پوچھا،'' کیا خانقاہی نظام ۔۔۔میرا مطلب ایک نیا خانقاہی نظام پھر سے مسلمانوں کو سمیٹ سکتا ہے؟''

''اے پسر وحید۔۔۔جان لیوے۔۔۔ہر عہد اپنے اسباب ہور اپنے وسیلے قائم کرے ہے ہور اُن سے کام لیوے ہے ۔ خانقاہیں آپنا فرض پورا کیے رہی ہیں۔''

''تو پھر اب ۔۔۔؟'' بے تابانہ میری زبان سے نکلا۔

مولانا کے چہرے پر ایک عجیب سا اطمینان دکھائی دینے لگا،''پسرم۔۔۔تو ایکے ایسے دین میں پیدا ہووے ہے جسے اللہ منبر جیسی نعمت سوں نواز رہا ہے۔جس کے سامنے ہر ملک ہر شہر ہر قریہ کے ہر محلے کے مسلمان دن میں پانچ بار جمع ہووے ہیں۔اپنی قوم سوں اُس کے صحیح استعمال کا طریقہ سکھائیو۔اسی منبر سوں دین کا صحیح پیغام دیویں ،مسلم معاشرے میں پیدا ہونے والے اندھیروں سوں واقف کروائیو۔ عصری علوم کی ضرورت ہور اہمیت سمجھاویں ۔ خوب یاد رکھیو۔۔۔دین کی تعلیم حاصل کرنا فرض ہووے جے تمہاری عاقبت سنوارے ہے ہور عصری علوم سوں غفلت دنیا میں رسوائی کا سبب ہووے۔''

ناول کا آخری باب نہایت اہم ہے۔اس آخری باب میں حسین ملک کی جمہوریت کا ایک ایسا خواب دیکھتا ہے جو ایک صحیح نظام کی آمد کا اعلان کرتا ہے۔لیکن جب وہ بیدار ہوتا ہے تو معلوم ہوتا اب بھی سب کچھ وہی ہے ۔ وہ حسین جو اب تک اپنی بیماری سے انکار کرتا تھا اُس کی سمجھ میں آجاتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی دیکھ رہا تھا وہ سب کچھ حقیقت نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی کو آواز دیتا ہے اور کہتا ہے میں واقعی شائزوفرونیا کا مریض ہوں ، مجھے دواخانہ میں شریک کردو۔

نورالحسنین کا یہ ناول صرف اُن کا ہی نہیں بلکہ یہ اُردو ادب کا ایک شاہ کار ناول ہے۔اس کی تیاری میں اُنھوں نے جس قدر محنت کی، زبان و بیان کی صحت کا خیال رکھا اور زبان کے جو تجربے کیے ہیں اُس میں وہ کامیاب ہیں۔اُن کی کردار نگاری یقیناً قابل تعریف ہے۔اس ناول میں بھی اُنھوں نے منظری تکنیک کے علاوہ شعور کی رو کا بھی نہایت خوبصورت استعمال کیا ہے۔اس ناول پر اُنھیں مبارک باد ملنی ہی چاہیے ۔ البتہ یہ بات کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ اس عظیم ناول کی جس طرح پروف ریڈینگ ہونا چاہیے تھی وہ نہیں ہوسکی اور اکثر مقامات پر غلطیاں جگہ پا گئی ہیں ۔اُمید کہ جب کبھی اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوگا وہ اس قسم کی اغلاط سے پاک ہوگا۔

مشتاق احمد وانی

آہ ۔۔۔میرے استادمحترم پروفیسر ظہورالدین!

(زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے)

2فروری 2019ء کی صبح کو میں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری (جموں وکشمیر) کے مولانا آزاد ہوسٹل کے کمرہ نمبر 105 میں بیٹھا لکھنے پڑھنے میں مصروف تھا اور کچھ ہی وقت کے بعد مجھے اپنے ڈیپارٹمنٹ چلے جانا تھا کہ اسی دوران جناب پروفیسر قدوس جاوید نے مجھے یہ مایوس کُن خبر سُنائی کہ پروفیسر ظہورالدّین صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے! مجھ پہ لمحہ بھر کے لیے سکتہ سا طاری ہوگیا۔دل میں غم کی اک ہوک سی اُٹھی۔یہ احساس رگ رگ میں اُتر گیا کہ بے شک ہم اللہ ہی کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کے جانا ہے۔میں نے اپنے بہت سے دوست واحباب کو یہ مایوس کُن خبر سُنائی۔میں تیار ہوا، گاڑی میں بیٹھا اور جموں کی طرف روانہ ہوگیا۔نوشہرہ کے قریب پہنچا تو دہلی سے ڈاکٹر مشتاق قادری صاحب کا فون آیا انھوں نے بھی استادمحترم پروفیسر ظہورالدّین کے گزر جانے کا دکھ ظاہر کیا۔سندر بنی کے نزدیک پہنچا تو میری اہلیہ نے مجھے فون پہ یہ اطلاع دی کہ جنازہ پانچ بجے ریہاڑی قبرستان (جموں) میں رکھا گیا ہے۔میرے دوست ڈاکٹر عبدالحق نعیمی سے بھی اس بات کی تصدیق ہوئی کہ جنازہ پانچ بجے ہوگا۔میں نے گاڑی کی رفتار تیز کردی اور پورے چار بج کر دس منٹ پر ریہاڑی قبرستان پہنچ گیا۔وہاں لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔نماز عصر پڑھنے کے بعد نماز جنازہ پڑھی گئی اور پھر دیکھتے دیکھتے میرے استادمحترم کو سُپرد خاک کیا گیا!۔وہ ہم سب کی نظروں سے دور چلے گئے۔نہ ختم ہونے والی جدائی کے ساتھ!

میں نے اپنے استادمحترم پروفیسر ظہورالدّین کے ساتھ اٹھائیس سال کا زمانہ گزارا ہے۔وہ ایک قابل ترین محنتی، اصول پرست اور خوش مزاج انسان تھے۔

گذشتہ اٹھائیس برسوں پر جب دھیان دیتا ہوں تو کئی یادیں مجھے بے چین کردیتی ہیں۔1985ء میں جب میں گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ میں بی اے فائنل کا امتحان دے رہا تھا تو میں نے پروفیسر ظہورالدّین صاحب کو پہلی بار دیکھا تھا۔ان کے ساتھ پروفیسر وی پی سُوری شعبۂ تعلیم جموں یونیورسٹی کو بھی بحیثیت معائنہ کار بھیجا گیا تھا۔امتحان میں نقل کی روک تھام کے لیے انھیں جموں یونیورسٹی کی طرف سے بھدرواہ بھیجا گیا تھا۔مجھے اچھی طرح یاد ہے بی اے فائنل کے پہلے پرچے سے لے کر آخری پرچے تک تقریباً ایک سو کے قریب نقل کرنے والے طالب علموں کو تین سال کے لیے امتحان سے برطرف کیا گیا تھا۔

1986ء میں نے جموں یونیورسٹی کے تحت اردو میں ایم اے کرنے کا پروگرام بنایا، فارم بھرا تو سیٹ مل گئی۔اس زمانے میں زیادہ تر شعبہ جات اور یونیورسٹی انتظامیہ کی عمارت کنال روڈ کے قریب ہوا کرتی تھی اسے اولڈ کیمپس کہا جاتا تھا۔میرے بہنوئی پروفیسر محمد اسداللہ وانی صاحب مجھے اردو شعبے میں لے گئے تھے۔ ظہورالدّین صاحب سے میری ملاقات کروائی تھی۔ پروفیسر منظر اعظمی صاحب، پروفیسر ظہور الدّین صاحب، پروفیسر خورشید حمرا صدیقی صاحبہ اور پروفیسر نصرت آراء چودھری صاحبہ ایک ہی کمرے میں بیٹھا کرتے تھے۔پروفیسر شیام لعل کالرا المعروف عابد پیشاوری صدر شعبہ ہوا کرتے تھے اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا اپنا ایک مخصوص کمرہ تھا۔شعبے کے یہ تمام اساتذہ بہت اچھے تھے خاص کر پروفیسر ظہورالدّین صاحب کا طریقۂ درس وتدریس بالکل منفرد تھا۔ان کی پُروقار اور بارعب شخصیت میں یہ بات شامل تھی کہ

جونہی وہ کلاس میں داخل ہوتے تو طلبہ وطالبات بالکل خاموش ہوجاتے۔ بڑی روانی کے ساتھ زبانی لیکچر دیتے تھے اور آخر پر طلبہ کی تشفی کے لیے انھیں اس بات کا موقع دیتے تھے کہ وہ ان سے سوالات پوچھیں۔ اردو ہی کی طرح انھیں انگریزی پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ پہلے سمیسٹر ہی میں انھوں نے مجھے اپنے افسانوں کا مجموعہ ''کینی بلز'' دیا تھا۔ جسے میں نے چند دنوں میں پڑھ ڈالا تھا۔ سنسکرت شعریات سے متاثر ہوکر انھوں نے ''تفکرات'' کے نام سے ایک کتابچہ تیار کیا تھا جو میں نے ان سے مانگ کے لیا تھا۔ اس کتابچے میں انسانی جذبات کی قسمیں بیان کی گئی تھیں۔

1987ء میں جب میں اسکول ٹیچر بھرتی ہوا تو بادل ناخواستہ اردو شعبے سے دور ہوگیا۔ مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق بہت زیادہ تھا اس لیے 1988ء میں اردو میں ایم اے کرنے کے فوراً بعد میں نے پی ایچ ڈی کرنے کا پروگرام بنایا لیکن ملازمت کی مدت تین سال نہ ہونے کی وجہ سے مجھے اپنے محکمے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا اجازت نامہ نہیں مل سکا۔ 1990ء میں، میں نے پی ایچ ڈی کا فارم بھرا اور ساتھ ہی اسکول ایجوکیشن ڈائریکٹر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا اجازت نامہ کی خاطر فارم بھر دیا۔ تقریباً چھ ماہ سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد مجھے اجازت نامہ موصول ہوا۔ اور پروفیسر شیام لعل کالرا صاحب کی نگرانی میں ''تلوک چند محروم : حیات اور ادبی خدمات'' کے موضوع پر تحقیق کرنا طے پایا۔ یہ موضوع چودہ ابواب پر مشتمل تھا۔ 1991ء میں میری شادی ہوگئی اور اسی سال یہ موضوع کسی اور امیدوار کو دیا گیا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری۔ 1993ء میں، میں نے دوبارہ پی ایچ ڈی کا فارم بھرا اور اب کی بار میں نے یہ مصمم ارادہ کیا کہ پروفیسر ظہورالدّین صاحب کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کروں گا۔ میں ان کے پاس آیا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ اس زمانے میں صدر شعبہ تھے۔ میں نے انھیں کہا

''سر۔۔ میں آپ کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہوں'' انھوں نے کہا ''اچھی بات ہے لیکن یہ بتایئے کہ آپ کا ذہنی میلان ادب کی کس صنف کی طرف ہے؟''

میں نے کہا ''فکشن'' پھر بولے ''ہاں اگر یہ بات ہے تو دو آدمی اب تک ایک موضوع چھوڑ چکے ہیں، میں اس پہ کام کروانا چاہتا ہوں ۔کیا آپ اس کے لیے تیار ہیں؟''

میں نے کہا ''ہاں سر میں تیار ہوں۔ موضوع بتایئے''

انھوں نے کہا ''موضوع ہے ''تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران'' کل میرے پاس آیئے اور اس موضوع کا خاکہ مجھ سے لے جایئے'' میں نے کسی حد تک خوشی محسوس کی۔ دوسرے دن جب انھوں نے مجھے مذکورہ موضوع کا خاکہ دکھایا تو میں پریشان ہوگیا ۔موضوع واقعی بہت زیادہ مشکل تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے پوچھا ''سر! یہ لفظ 'بحران' میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ یہ بحران کیا ہوتا ہے؟'' ظہور صاحب تھوڑا سا مسکرائے، پھر کہنے لگے ''ایک ایسی اُتھل پُتھل اور تشویشناک ماحول کا پیدا ہونا کہ اس سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آئے اسے بحران کہتے ہیں اور انگریزی میں اسے Cricis کہتے ہیں یا یوں سمجھ لیجیے کہ اگر کوئی کشتی سمندر میں کسی طوفان کی زد میں آجائے تو اس میں سوار لوگوں کی جو ذہنی کیفیت رہے گی اسے بحران سے تعبیر کیا جائے گا۔ آپ کو اردو ناولوں میں تہذیبی بحران کی نشاندہی کرنی ہے'' میرے اس موضوع کو پانچ ابواب میں منقسم کیا گیا تھا۔ پہلے باب کا تعلق جدید تہذیبی بحران سے تھا۔ دوسرے باب میں اقوام عالم میں تہذیبی بحران کو شامل کیا گیا تھا۔ تیسرے باب میں یہ ثابت کرنا تھا کہ اردو ناول میں جدید تہذیبی بحران کی عکاسی ذہنی، سیاسی، سماجی، تعلیمی، اقتصادی، مذہبی اور ازدواجی اعتبار سے کس حد تک نظر آرہی ہے۔ چوتھے باب کا تعلق موضوعاتی اور ہیئتی اعتبار سے تہذیبی بحران کا اردو ناول پر اثر سے تھا اور پانچویں باب

میں محاکمہ رکھا گیا تھا۔ان چاروں ابواب میں بہت سے ذیلی عنوانات رکھے گئے تھے۔جن تک میری ذہنی رسائی اور مواد کی فراہمی مجھے مشکل نظر آرہی تھی لیکن اس کے باوجود میں نے اللہ کا نام لے کر اس موضوع سے متعلق مضامین اور کتابیں خرید کر پڑھنا شروع کیا۔ پارٹ ٹائم ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے مجھے یہ کام اور بھی مشکل نظر آرہا تھا۔ان دنوں میں ایک پرائمری اسکول کا ٹیچر تھا ۔مجھے پری پی ایچ ڈی کا کورس کرنے کے لیے چھٹی لے کر جموں آنا پڑا ۔غالباً اپریل 1994ء میں میرا نام پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹرڈ ہوا۔ پہلا باب لکھنے سے پہلے میں ایک روز ظہور صاحب کے پاس آیا اور ان سے کہا ''سر۔۔میں چاہتا ہوں آپ مجھے اُن ناولوں کے نام بتائیں جو تہذیبی بحران کے زُمرے میں آتے ہیں'' وہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے ''دیکھیے جب ہم اردو ناول میں تہذیبی بحران کی بات کرتے ہیں تو اس کے ابتدائی نقوش ہمیں پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانہ آزاد'' میں نظر آنے لگتے ہیں۔گویا تقسیم ہند سے قبل بھی کچھ ناول ایسے ضرور ہیں جن میں تہذیبی بحران کی جھلکیاں موجود ہیں۔آپ کچھ ناولوں کے نام نوٹ کیجیے'' انھوں نے پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانہء آزاد'' سے سفر شروع کیا اور الیاس احمد گدی کے ناول ''فائر ایریا'' تک 19 ناول لکھا لیے۔میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ظہور صاحب کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا ۔انھوں نے بھی میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا پھر کہنے لگے ''مجھے امید ہے آپ اس موضوع پہ کام کریں گے'' پہلے باب سے متعلق جب میں نے بہت سی کتابیں خرید کر پڑھیں اور نوٹس لیے تو ذہن لکھنے پر آمادہ ہوا۔تقریباً دو ماہ کے بعد جب میرا پہلا باب مکمل ہوا تو میں اپنے گاوں مانتلائی سے چنہنی آیا۔ایس ٹی ڈی سے ظہور صاحب کو فون کیا جموں ان کے گھر میں لینڈ لائن فون ہوتا تھا۔اس زمانے میں آج کی طرح موبائل فون اور انٹرنیٹ کی کوئی بھی سہولت نہیں تھی ۔میں نے اپنا پہلا باب چیک کروانے کے بارے میں ان سے بات کی تو انھوں نے فوراً ہامی بھری اور مجھے اتوار کے دن شعبہء اردو میں آنے کو کہا۔وہ اکثر اتوار کے دن بھی چند گھنٹوں کے لیے شعبے میں آتے تھے۔مقررہ تاریخ پر جب میں اپنا کام لے کر شعبۂ اردو میں پہنچا تو ظہور صاحب اپنے کمرے میں بیٹھ چکے تھے۔علیک سلیک کے بعد جب میں نے اپنی فائل ان کے سامنے رکھی تو کام چیک کرنے سے پہلے کہنے لگے ''میں ریسرچ اسکالر کو محنت سے کام کروانے کا عادی ہوں ۔تحقیق کا کام نہایت صبر آزما اور دقّت طلب کام ہوتا ہے ۔مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا ہونا چاہیے۔آپ ڈگری کے لیے کام نہ کیجیے بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کام سے ادب میں آپ کی ایک شناخت قائم ہو'' میں نے دھیان سے ان کی باتیں سُنیں اور ان پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔بہ فضل اللہ میرے تحقیقی کام میں انھیں بہت کم غلطیاں نظر آتی تھیں جن کی وہ سُرخ پین سے نشاندہی کرتے تھے۔تقریباً پچاسوں صفحے وہ ایک ہی نشست میں پڑھ لیتے تھے۔زبان کی باریکیوں پر خاص دھیان دیتے تھے تحقیق کے اصولوں پر سختی سے پابندی کراتے تھے۔عالمانہ زبان وبیان کو بہت پسند کرتے تھے۔ساڑھے تین سال میں، میں نے تین باب مکمل کر دیے اور جب چوتھے باب پر آیا تو اس پر اٹک گیا۔اس باب میں مجھے تہذیبی بحران کا اردو ناول پر موضوعاتی، ہئیتی اور زبان وبیان کے اعتبار سے اثرات کی نشاندہی کرنا تھی۔پہلی بار چوتھا باب لکھنے کے بعد جب میں نے اسے ظہور صاحب کو دیکھا یا تو آدھا گھنٹہ پڑھنے کے بعد انھوں نے کہا ''اس میں تو وہ بات آئی نہیں جو میں چاہتا ہوں۔اسے دوبارہ لکھ کے لے آیئے۔ پہلے اس موضوع کے بارے میں پڑھیے، پھر سوچیے اور اس کے بعد لکھیے'' میں مایوس ہوا۔وہ ریسرچ اسکالر سے یہ امید رکھتے تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے ذہن کا استعمال کرے۔کاتا اور لے دوڑی

والی بات انھیں ناپسند تھی۔تقریباً بیس دن کے بعد جب میں دوبارہ ان کے پاس لکھ کے لے گیا تو انھوں نے پھر وہی بات دوہرائی کہنے لگے'' وہ بات نہیں بن پارہی ہے جو میں چاہتا ہوں۔اسے دوبارہ لکھ کے لے آیئے''میری مایوسی میں حیرت شامل ہوگئی۔میں اٹھااور بوجھل قدموں سے ظہور صاحب سے رخصت ہوگیا۔تیسری بار پھر اس امید کے ساتھ لکھ کے لے گیا کہ اب یہ قابل قبول ہوگا لیکن انھوں نے جونہی کوئی دو صفحے پڑھے تو ان کے چہرے پہ ناگواری کے آثار ابھر آئے اور کہنے لگے'' آپ موضوع سے باہر جارہے ہیں ہمیں موضوعاتی اور ہیئتی اعتبار سے اردو ناول میں تہذیبی بحران تلاش کرنا ہے۔بیان بازی سے کام نہیں چلے گا۔معتبر حوالے دیجیے'' میرے ماتھے پہ پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ اب کی بار میں کافی مایوس ہوا۔انھوں نے فائل میرے حوالے کی۔میں ان کے کمرے سے باہر نکل آیا اور ذہنی کوفتون سے مغلوب ہوکر دل نے یہ چاہا کہ میں پی ایچ ڈی نہیں کروں گا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اس احمقانہ خیال کو ذہن سے نکال دیا۔گھر پہنچا تو دیکھا کہ گھر میں ڈاکیہ نے لکھنو کے پبلشر کی ارسال کردہ میرے نام ایک فہرست کُتب ڈال دی تھی۔میں نے اس فہرست کُتب پہ نظریں دوڑائیں تو جدید نال کے فن پر چند کتابیں نظر آئیں۔میں نے فوراً بذریعہ ڈاک یہ کتابیں منگوالیں۔کوئی دس دن کے اندر مجھے یہ کتابیں موصول ہوئیں۔میں نے انھیں ذہنی یکسوئی کے ساتھ لفظ لفظ پڑھا بہت سی نئی معلومات حاصل ہوئی۔جب مجھے اس بات کا اطمینان ہوا کہ اب مجھے کیا لکھنا ہے اور کیا نہیں لکھنا ہے تو میں نے ذہن میں پھر سے ایک خاکہ تیار کیا۔معتبر حوالوں کا انتخاب کیا اور لکھنے سے پہلے دو رکعت صلوٰۃ الحاجت پڑھی اور اللہ کا نام لے کر لکھنے بیٹھ گیا تقریباً اٹھارہ دن میں، میں نے چوتھا باب مکمل طور پر لکھ ڈالا۔میں نے ظہور صاحب سے فون پہ رابطہ قائم کیا انھوں نے اتوار کے دن شعبے میں آنے کی اجازت دے دی۔اس روز میں ظہور صاحب کے آنے سے پہلے ہی شعبے میں پہنچ گیا۔کچھ ہی وقت کے بعد مجھے ان کی گاڑی آتی نظر آئی۔میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔وہ گاڑی سے اترے تو میں نے سلام کیا۔ڈرتے ڈرتے ان کے کمرے میں داخل ہوا۔وہ کرسی پہ بیٹھے۔انھوں نے چپراسی سے پانی منگوایا۔پانی پینے کے بعد مجھ سے فائل مانگی اُدھر وہ میرا کام چیک کرنے لگے اور ادھر میں ذکر الٰہی میں لگ گیا۔کوئی دو گھنٹے گزر جانے کے بعد انھوں نے کہا''اب آپ راہ راست پر آگئے ہیں''اس کے بعد وہ مسلسل باقی کام دیکھتے رہے۔پورا باب چیک کرنے کے بعد انھوں نے مجھے فائل پکڑاتے ہوئے کہا''بہت اچھا یہ لیجیے''مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے آج میرے سر سے منوں بوجھ اُتر گیا ہو۔پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کے بعد میں نے اس کی کتابت خود کی تھی۔اس طرح پورے ساڑھے چار سال کے بعد مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی تھی۔میرے اس تحقیقی مقالے میں میری محنت ولگن، ذوق وشوق اور صبر آزمائی کے علاوہ میرے شفیق استاد محترم پروفیسر ظہور الدّین کی دیانتدارانہ رہنمائی شامل تھی اس لیے یہ مقالہ محنت شاقہ اور ادبی معیار کا حامل قرار پایا۔یہی وجہ رہی کہ 2002ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی جیسے اردو کے ایک بڑے ادارے نے مجھ سے یہ فرمائش کی کہ ہم اسے کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔452 صفحات پہ مشتمل میرے اس تحقیقی مقالے کو اردو ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔مجھ جیسے ناچیز کی یہ کتاب یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں حوالہ جاتی کُتب میں شامل ہے۔

میرا یہ ماننا ہے کہ والدین اپنی اولاد کے روشن مستقبل کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے لیکن جہاں تک ایک بہترین استاد کی استادی کا تعلق ہے وہ مینارہء نور کی حیثیت رکھتی ہے۔پروفیسر ظہور الدّین صاحب ایک اچھے انسان تو تھے ہی ایک بہترین استاد بھی تھے۔بہت زیادہ نفاست پسند،سلیقہ شعار،اردو زبان وادب

کے ماہر اور خیر خواہ ، تہذیب وشائستگی کے دلدادہ۔متانت وسنجیدگی کی ایک مجسم صورت تھے۔وہ 27 مئی 1942ء کو ایک دور دراز گاوں کھنیڈ، تحصیل رام نگر، ضلع ادھم پور، صوبہ جموں میں پیدا ہوئے تھے۔ان کے والد صاحب خواجہ خضر دین پولیس میں تھانیدار تھے اور والدہ کا نام تاج بیگم تھا۔ظہورالدّین صاحب کی ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے آبائی گاوں کھنیڈ کے پرائمری اسکول سے ہوا لیکن دوسری جماعت کے بعد ان کے والد صاحب کا تبادلہ بسوہلی ضلع کٹھوعہ ہوگیا۔بعد میں اعلیٰ تعلیم جموں میں حاصل کی ۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پروفیسر ظہورالدّین صاحب پولیس میں سب انسپکٹر کی ملازمت چھوڑ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں لگ گئے تھے۔

پروفیسر گیان چند جین ان کے استاد رہ چکے تھے۔جن کی علمی وادبی صلاحیتوں سے وہ بہت زیادہ متاثر تھے۔کتابیں پروفیسر ظہورالدّین صاحب کی زندگی کا اہم سرمایہ تھیں۔کئی علمی، ادبی اور لسانی مباحث پر ان کی کتابیں ان کی قدآور علمی وادبی شخصیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں ۔وہ شاعر بھی تھے، ماہر عروض بھی، افسانہ نگار بھی، اعلیٰ پایہ کے محقّق وناقد بھی اور ایک قابل اعتماد مترجم بھی۔ان کی یادگار تصنیفات سے اردو کی نئی نسلیں مستفید ہوتی رہیں گی۔حق پرستی، خودداری، بیبا کی اور غیر مصلحت پسندی یہ تمام خوبیاں ان کی شخصیت میں موجود تھیں۔آیئے ان کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالتے چلیں:

1۔تلافی (افسانوں کا مجموعہ) 2۔تفکرات (تنقیدی مضامین) 3۔محروم کی شاعری (تلوک چند محروم پر مقالہ) 4۔اوڈی سوز (طویل افسانہ) 5۔بیسویں صدی کے اردو ادب پر انگریزی کے ادبی رجحانات (پی ایچ ڈی کا مقالہ)۔کینی بلز (افسانوں کا مجموعہ) 7۔حقیقت نگاری اور اردو ڈراما (تحقیق وتنقید) 8۔Development of urdu Language and Literature in Jammu Region (ڈی لٹ کا مقالہ) 9۔تعلیل وتاویل (تنقیدی مضامین) 10۔ارمغان آزاد (تنقید) 11۔تنقیدی مباحث وتجزیے (تحقیقی وتنقیدی مضامین) اس کے علاوہ انھوں نے جے اینڈ کے بورڈ آف اسکول ایجوکیشن کے لیے مشترکہ طور پر پہلی سے بارہویں جماعت تک اردو کی نصابی کتابیں تیار کیں۔اردو ادب کے حوالے سے ایک تاریخ ساز کام انھوں نے یہ بھی کیا کہ شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی سے ایک ششماہی رسالہ ''تسلسل'' کے نام سے جاری کروایا۔ ان ادبی سرگرمیوں کے علاوہ پروفیسر ظہورالدّین صاحب جموں یونیورسٹی کے رجسٹرار، کنٹرولر اور دوبار صدر شعبہ بھی رہے۔اپنی صدارت شپ میں کئی قومی اور بین الاقوامی سیمی نار، کانفرنسیں اور ورکشاپس منعقد کروائیں۔ہر ممکنہ حد تک ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں کوشاں رہے۔کئی مقامی انجمنوں اور بالخصوص یوپی اردو اکیڈمی نے ان کی کتابوں پر چھ انعامات دیے۔ایک سنجیدہ اور دیانتدار انسان ہونے کے ناطے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری انجمنوں نے بحیثیت ایک فعال رُکن کے ان کی خدمات حاصل کیں۔مثلاً وہ جموں یونیورسٹی کونسل کے سیکرٹری، سیکریٹری جموں یونیورسٹی سنڈیکیٹ، کنوینر بورڈ آف اسٹڈیز ان اردو لینگویجز، جموں یونیورسٹی فنانس کمیٹی، سیکریٹری یونیورسٹی پبلیکیشن بورڈ، ایڈیٹر ان چیف یونیورسٹی نیوز بلیٹن، جنرل سیکریٹری انجمن اساتذہ ءاردو جامعات ہند، سیکریٹری انجمن ترقی اردو ہند جموں شاخ، ممبر سب کمیٹی جے اینڈ کے اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز اور چیرمین مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی جموں قابل ذکر ہیں۔

جنوری 2004ء میں مجھے دعوت حق (قُرآن وحدیث) کے سلسلے میں ایک جماعت کے ساتھ تحصیل رام نگر میں کام کرنے کا موقع ملا۔ جماعت کا رُخ بیریاں بلہوتہ اور بسنت

گڑھ کے مضافاتی علاقوں کی طرف تھا۔ چالیس دن کے اس دعوتی سفر میں میرے دل میں ایک روز یہ خواہش ابھری کہ میں اپنے استاد محترم پروفیسر ظہورالدّین کا علاقہ اوران کی جائے پیدائش دیکھ آوں ۔میں نے امیر جماعت جناب عبدالحمید بٹ المعروف مصروف گلاب گڑھی سے اس بات کا اصرار کیا کہ وہ جماعت کو کھنیڈ لے چلیں۔وہ تیار ہوئے ۔برف پوش پہاڑوں کا ایک سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔تیسرے دن ہماری جماعت کھنیڈ کے لیے روانہ ہوگئی ۔میں خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہا تھا۔پہلی بار اپنے استاد محترم کا آبائی گاوں دیکھنے جارہا تھا۔بیریاں بلہوتہ سے سیدھی چڑھائی تقریباً13 کیلومیٹر چڑھنے کے بعد جب ہم چوچروگلا پہنچے تو برفیلے راستے پہ چلتے ہوئے ہمارے پیر پھسلنے لگے۔عبدالحمید بٹ صاحب نے بآواز بلند نعت گانا شروع کردی جماعت کے تمام ساتھیوں نے بھی ان کا ساتھ دینا شروع کیا۔دیودار،توس، چیڑ اور دوسرے قسم کے سایہ دار درختوں سے گزرنے کے بعد یہ دعوت حق کا قافلہ شام کو چار بجے کے قریب کھنیڈ پہنچا۔جامع مسجد کے بالکل قریب ظہورصاحب کا مکان دیکھا۔ دوسرے دن ان کے خاندان کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔کدواہ،لودرہ، پنارہ اور سنگ نام کے یہ گاوں علاقہ کھنیڈ کو تشکیل دیتے ہیں ۔فطری مناظر سے آراستہ یہ علاقہ دل کو موہ لینے والا ہے لیکن ابھی تک گاڑیوں کی آمد ورفت سے محروم ہے کیونکہ سڑک ابھی زیرتعمیر ہے۔اس علاقے کے وسط میں ایک دریا بہتا ہے جس کا نام دریائے اُج ہے۔

1998ء میں جموں یونیورسٹی نے مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی تو میرے دل میں یہ شوق پیدا ہوا کہ میں اردو میں ڈی لٹ کروں گا ۔اس سلسلے میں بھی میں نے جب پروفیسر ظہورالدّین صاحب کے ساتھ مشورہ کیا تو انھوں نے خندہ پیشانی سے میری حوصلہ افزائی کی۔موضوع کے انتخاب میں بھی انھوں نے میری مدد کی۔''اردو ادب میں تانیثیت'' کا خاکہ تیار کرنے میں ظہور صاحب نے کوئی بھی کسر اُٹھائے نہیں رکھی۔میرا یہ خواب بھی اللہ تعالےٰ نے شرمندہ ءتعبیر کردیا۔پورے دس سال کے بعد 2012ء میں جب روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی (یوپی) نے مجھے ایک کنوویکشن میں ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔میں نے جب یہ خوشخبری ظہورصاحب کوسُنائی تو وہ بہت خوش ہوئے۔انھوں نے مجھے مبارک بادی۔جب 2013ء میں میرا یہ مقالہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے کتابی صورت میں شائع کیا جو780 صفحات پہ مشتمل ہے تو ظہورصاحب اسے دیکھ کے بہت خوش ہوئے بے ساختہ کہہ اُٹھے''میں آپ کی ہمت اورحوصلے کوداد دیتا ہوں۔آپ کی محنت رنگ لائی'' بلاشُبہ ظہورالدّین صاحب علم وادب کے ہیرو تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے غرور وتکبر اور نانیت کو کبھی بھی اپنے مزاج کا حصہ بننے نہیں دیا۔اپنی عاجزی وانکساری اوراحساس کمتری کا اظہار وہ کئی موقعوں پہ کرچکے ہیں۔بہ فضل اللہ یہ احساس کمتری کی صفت شروع ہی سے میری سرشت میں بھی موجود ہے۔میرااس بات پہ یقین ہے کہ جس طرح ہرکسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا اسی طرح کوئی بھی آدمی اپنے آپ میں مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔دوسری بات یہ بھی ہے کہ یہ احساس کمتری ہی ہے جو ہمارے سیکھنے کے دروازے کھلے رکھتا ہے۔میں نے زندگی کے کئی مسائل ومعاملات میں ظہورصاحب سے مشورے کیے ہیں،ان کی رائے کا احترام کیا ہے۔میں کئی بار پنچ تیرتھی جموں میں ان کے کوارٹر میں گیا ہوں۔ان سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ملک مارکیٹ جموں میں ان کے مکان میں گیا ہوں۔بہت قریب سے میں نے اپنے استادمحترم کو دیکھا ہے، سُنا ہے،سمجھا ہے۔موبائل فون پہ کئی بار باتیں کی ہیں۔

2 جنوری2017ء کو میں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں اسسٹنٹ پروفیسر کی پوسٹ پہ جوائین کرنے کے بعد جب ظہورصاحب کے گھر پران سے ملاقات کرنے گیا تو بڑے پُر

تپاک انداز میں مجھ سے ملے۔ مجھے مبارک باد دی۔خوشی کا اظہار کیا لیکن بعد میں حسرت آمیز لہجے میں کہنے لگے ''مشتاق کو آج سے 20 سال پہلے ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں اردو کا اسسٹنٹ پروفیسر بن جانا چاہیے تھا!'' میں نے ان کی خیریت پوچھی تو کہنے لگے ''میں اب بیمار رہتا ہوں۔بیٹوں نے مجھے گاڑی ڈرائیو کرنے سے منع کر دیا ہے۔لکھنا پڑھنا بھی بہت حد تک چھوٹ گیا ہے'' میں ان کی باتیں سُن کر کسی حد تک مایوس ہوا۔

2018ء میں پروفیسر ظہور صاحب کے دن زیادہ تر بیماری میں گزرے۔ستمبر کے مہینے میں ایک روز میں ان کی خیریت معلوم کرنے ان کے گھر چلا گیا۔وہ برآمدے میں کرسی پہ بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو خوش ہوئے۔بہت سی باتیں ہوئیں۔کوئی ایک گھنٹہ ملاقات رہی ہوگی۔ان کے چہرے سے تھکان کے سے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔میں ان سے رخصت ہوا۔اپنے گھر سنجواں چلا آیا اور دوسرے دن بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری چلا گیا۔تقریباً چوبیس دن کے بعد میں اور میری اہلیہ جب ظہور صاحب کی خیر پُرسی کے لیے ان کے گھر چلے گئے تو وہ اور ان کی اہلیہ محترمہ برآمدے میں کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ظہور صاحب کے ہاتھ میں پین اور چند سفید کاغذ تھے۔وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے پہلے ایک آزاد نظم اُن کاغذوں پہ لکھ چکے تھے۔ان کی یہ آزاد نظم جس کا عنوان ''اس سے'' ہے اردو کے ایک معیاری اور موقر رسالہ ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی، اکتوبر 2018ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ اتفاق کی بات یہ کہ اسی شمارے میں مجھ ناچیز کی ایک کہانی ''ریٹ لسٹ'' بھی شائع ہوئی ہے جس میں ایک ادیب کی زندگی کا المیہ بیان کیا گیا ہے ۔ یہ نظم ظہور صاحب کی آخری تحریر ہے۔نظم ملاحظہ فرمائے:

صبح ہی تو کہا تھا اس نے مجھے
تُو دریا ہے مگر پانی نہیں ہے
عجب انداز تھا اُس کے بیاں کا
ذکر تو تھا کسی دردنہاں کا
سوچتا رہ گیا میں دیر تلک
کھوجتا رہ گیا میں دیر تلک
اُس نے کیوں مجھ سے یوں خطاب کیا
بولو بولو یہ کیا جناب کیا
اُس کی باتوں نے کر دیا مجھے بیتاب
نیند میری اُڑی اسے سُن کر
جان نکلی مری اسے سُن کر
ایسا بھی وہ یاد اکثر آتا ہے
اس کا کہنا ہے اب بھی یاد مجھے
لوگ اب بھی پُکارتے ہیں اُسے
صبح صبح نہارتے ہیں اُسے
لوگ کہتے ہیں آئے گا وہ اک دن
بیتی اپنی سُنائے گا وہ اک دن
رات کا درد گُزر جائے گا
کوئی ہمدرد مل ہی جائے گا
چاند اُترے گا چاندنی بن کر
راگ کوئی یا راگنی بن کر
آ ؤ مل کر اسے بلاتے ہیں
گیت کوئی اُسے سُناتے ہیں
زندگی ایک ٹیڑھا آنگن ہے
سنگ ریزوں پہ ناچنا ہوگا
خون ٹپکے گا جب بھی تلووں سے
اک ہتھیلی پہ ناچنا ہوگا
میرا محبوب ہے وہ برسوں سے
آج کل سے نہیں نہ نرسوں سے

اُس کے پہلو میں جب بھی ہوتا ہوں
اپنے سارے گناہ دھوتا ہوں
اُس نے دی ہے جو زندگی مجھ کو
کس نے دی ہے وہ زندگی مجھ کو
اُس کی محبتوں کے طفیل
آج بھی جی رہا ہوں مثلِ غلیل

دسمبر 2018ء کے دوسرے ہفتے میں جب میں راجوری سے گھر آیا تو دوسرے دن ظہور صاحب کی خیریت معلوم کرنے ان کے گھر چلا گیا۔ وہ بستر پہ لیٹے ہوئے تھے۔ ایک خدمتگار ان کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ ظہور صاحب کو دوائی کھلانے کا وقت ہو چکا تھا۔ خدمتگار نے انھیں جگایا اور بار بار انھیں میرے بارے میں کہنے لگا ''صاحب جی! یہ دیکھو جی یہ آپ سے ملنے آئے ہیں۔ ان سے بات کرو جی'' ظہور صاحب جاگ گئے۔ میں نے نزدیک جا کر انھیں سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا لیکن جسمانی ضعف اور تکلیف کے باعث وہ مجھ سے صحیح طرح باتیں نہیں کر پائے۔ میں انھیں دیکھ کے مایوس ہوا!۔ دسمبر کے آخری ہفتے میں، میں اور میری اہلیہ ان کی خیریت معلوم کرنے ان کے گھر گئے۔ وہ سوئے ہوئے تھے۔ ان سے کوئی بھی بات نہیں ہو سکی اور نہ ہی انھیں جگانا مناسب سمجھا۔ یہ ہماری ظہور صاحب کے ساتھ آخری ملاقات تھی۔ میرے شعور، تحت الشّعور اور لاشعور میں ان کی یادوں کی پرچھائیاں رچ بس گئی ہیں۔ ان کی حسین شبیہہ اور ان کی باغ و بہار شخصیت میری آنکھوں میں منڈلاتی رہتی ہے۔ ان سے جُڑی یادیں مجھے آنسو بہانے پر مجبور کر رہی ہیں۔ دراصل ہم سب وقت کے دریا میں بہہ رہے ہیں۔ اس بات کا یقین کسی شاعر کے ان اشعار سے بھی ہو جاتا ہے:

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں

پروفیسر ظہور الدّین صاحب کی اہلیہ محترمہ دُرِ شہوار انتہائی نیک، جہاں دیدہ اور وفادار خاتون ہیں کہ جوان کی زندگی میں بہار بن کر آئیں۔ اللہ ان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ بُزرگوں کا قول ہے کہ اچھے انسان کی اچھی اولاد ہوتی ہے۔ پروفیسر ظہور الدّین صاحب کے دو پیارے وفادار بیٹے سُہیل ظہور اور اسیر ظہور نے اپنے والد کی بہت خدمت کی ہے۔ بڑا بیٹا سُہیل ظہور ڈاکٹر ہے اور چھوٹا بیٹا انجینئر ہے۔ دونوں شادی شدہ ہیں۔ اللہ تعالےٰ پروفیسر ظہور الدّین صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین!

شرح

دیوانِ غالب

شارح

سید محمد ضامن کنتوری

مرتبہ

اشرف رفیع

قیمت: -/1200 روپے

-/800 طلباء ایڈیشن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

www.ephbooks.com

یادیں

اتنی ساری یادوں کے ہجوم میں ایک شخص کی یاد جو میری زندگی کا حصہ بن گئی میرے لیے بہت اہم ہے۔

ایک ان جانی زبان میں دو تین کتابوں کا مصنف اخباروں میں بہت سارے مضامین لکھنے والے شخص کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ میں یہاں یعنی حیدرآباد میں رہتی بھی تو نہیں تھی جب کبھی ممبئی سے چند دنوں کے لیے حیدرآباد آتی تو دوستوں سے ملاقات ہو جاتی انہیں گھر پر بلا لیتی۔ کھانے پینے کی پریشانی نہیں تھی۔ کیوں کہ پاپا کے گھر میں صرف بول دینا ہی کافی تھا کہ رات ڈنر پر اتنے لوگ آنے والے ہیں۔ جو بھی نارمل کھانا پکتا اس میں ایک دو ڈش اور اضافہ کر دیئے جاتے تھے۔ ایک دن مخدوم اور ششندر آئے۔ دن ڈھل گیا تھا شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے باتیں چل رہی تھیں مگر ششندر چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے کچھ بھی بول نہیں رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے واقف تھے۔ اچھی طرح واقف تھے مخدوم بولتے رہے اور وہ خاموش ہی خاموش تھے۔ رات ٹریس پر کھانا لگا اسی خاموشی کے ساتھ کھانے کے بعد وہ چلے گئے۔ دوسرے دن مخدوم آئے تو کہا ''ششندر سے آپ کی کیسی دوستی ہے؟'' مخدوم کے لہجے میں کچھ تبدیلی تھی۔ میں نے سوچا مخدوم کبھی ایسی باتیں نہیں کرتے آج انہیں کیا ہو گیا۔ پھر خیال آیا ششندر تلگو کا شاعر ہے نا اس لیے چوٹ کر رہے ہیں۔

کئی مہینے گزر گئے۔ تلگو رائٹرس کانفرنس ہونے والی تھی مجھے اس کے لیے وائس پریسیڈنٹ بنایا گیا جس میں سنجویا اور برہمانند ریڈی پریسیڈنٹ تھے کانفرنس کا افتتاح تھا۔ شمع روشن کرنے کے لیے مجھے بھی آگے بلایا گیا۔ اخباروں میں نیوز چھپی تصویریں آئیں اسے پڑھ کر دوسرے دن مخدوم گیان باغ آئے کہا۔

''آپ کو تلگو آتی ہے نہ آپ سمجھ سکتی ہیں آپ کیوں گئیں اس فنکشن میں مجھے مخدوم کے اس سوال پر حیرانی ہوئی تلگو نہیں آتی تو مجھے شرمندگی ہونی چاہیے یہ ان لوگوں کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ مجھے اس کا وائس پریسیڈنٹ بنایا۔ مگر میں مخدوم کو کیسے سمجھاتی۔ ایسا بھی نہیں تھا مخدوم اس بات کو نہیں جانتے تھے کیوں کہ وہ خود تلگو اچھی طرح جانتے تھے بولتے تھے۔ میں نے کہا میں اس اسٹیٹ میں رہتی ہوں جس کی زبان تلگو ہے مجھے چاہیے کہ میں اپنے اطراف کی زبان والوں سے قریب رہوں ان کے ادب کو جانوں اور ہونا بھی یہ چاہیے کہ اردو والے اپنی اسٹیٹ کی زبان اور ادب کو سمجھیں پڑھیں نہ صرف تلگو کو بلکہ دوسری زبانوں کے ادب سے بھی واقف ہوں تب ہی تو وہ سمجھ سکیں گے کہ وہ اور ان کا ادب کہاں کھڑا ہے''۔

میں داسرتھی سے مل چکی تھی اور ان سے پہلے سری سری کی ایک طویل نظم ''تھری چیئرز فار مین'' پڑھ چکی تھی جو ان کی نظم کا انگریزی ترجمہ تھا۔

کانفرنس کا ایک اجلاس مجھے Preside کرنا تھا ششندر کنوینر تھے۔ انہوں نے اپنی باری آئی تو تقریر انگریزی میں کی۔ مجھے تعجب ہوا۔ وہ انگریزی بھی اچھی بول رہے تھے۔

یہ شخص جو تلگو کا شاعر ہے، جس کو یہاں کے لوگ پسند بھی نہیں کرتے جس کا کوئی پبلشر بھی نہیں بظاہر جس کا ادب میں کوئی مستقبل بھی نہیں۔ یہ کیسے بدلا میں نے سوچا ایک Writer کو

اس کی کتابوں سے نہیں جانچ سکتے ہیں۔اس کے ہم عصر شاعر اسے Discourage کرتے آرہے ہیں مگر اس میں کچھ ہے جو مستقبل کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ میں نے ان کی انگریزی کی چیزیں پڑھیں جو تلگو سے ترجمہ کی گئی تھیں تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ تو ایک الگ آواز ہے اس کا مستقبل تابناک ہوسکتا ہے۔تلگو کے شاعر بڑی بڑی طویل نظمیں لکھتے ہیں جب کوئی سمیلن میں اپنی نظمیں سناتے تو مجھے نیند آجاتی تھی۔ششندر بھی طویل نظمیں ہی لکھتے تھے اس کے بعد وہ چھوٹی چھوٹی مگر اچھی نظمیں لکھنے لگے۔کوئی سمیلن میں طویل نظمیں کامیاب نہیں ہوسکتیں دومنٹ سے زیادہ سامعین کی توجہ کو آپ حاصل نہیں کر سکتے۔ مشاعروں میں بھی غزل اسی لیے کامیاب ہوتی ہے کہ اس کا ہر شعر الگ الگ ہوتا ہے اظہار کی توانائی جو غزل کے شعر میں ہے وہ سامعین کو اپنی گرفت میں جکڑ کر رکھتی ہے اس کے مقابلے نظمیں اور وہ بھی طویل نظمیں سامعین سے خاطر خواہ داد وصول نہیں کرسکتیں نہ متاثر کرسکتی ہیں میں نے سوچا ششندر کو ہندی اور اردو میں بھی آنا چاہیے۔کیوں کہ ہندی، تلگو کے سنسکرت touch سے بہت قریب ہے حالاں کہ دونوں کے لسانی خاندان جدا جدا ہیں۔میں نے ششندر کو اس بات پر راضی کرلیا کہ ان کا اردو میں بھی ترجمہ ہونا چاہیے اس وقت اختر حسن اور غیاث صدیقی میرے سامنے تھے انہوں نے بھی ساتھ دیا۔اس وقت تک میں ہندی اکیڈمی کی پریسیڈنٹ ہوچکی تھی اوم پرکاش نرمل، اختر حسن اور غیاث صدیقی ساتھ ساتھ بیٹھ کر ترجمہ کرتے تھے۔نرمل جی تلگو سے ہندی میں اور ہندی سے اختر حسن اور غیاث صدیقی اردو میں ترجمہ کرتے تھے یعنی ترجمے کا ترجمہ ہورہا تھا اختر حسن نے ''میری دھرتی میرے لوگ'' کا ترجمہ کیا اور صدیقی نے ''نیلم کے پنکھ'' کا ترجمہ کیا اس وقت ہماری شادی ہوچکی تھی اس طرح وہ اور ان کی شاعری سنورنے لگی۔ان کی شخصیت میں بھی نکھار آیا۔خود اعتمادی آئی اور اب وہ ایک الگ روپ لینے لگے تھے۔ میں یہ سمجھنے لگی کہ بڑے شاعر کو جاننا ہے تو اس کی بیوی سے ملیں۔علی سردار جعفری کی بیوی خوب صورت تھی۔ پڑھی لکھی تھی خوش مزاج اور شوہر کی مزاج شناس بھی تھی۔جب بھی وہ حیدرآباد میں ہوتیں تو ہر روز شام کو مجھے فون کیا کرتی تھیں۔کیفی کو سمجھنے کے لیے ان کی بیوی بلکہ بیٹی سے ملیئے۔فیض کی بیوی ایلس جاں نثار اختر کی بیوی صفیہ اختر کی خطوط پڑھ کر جاں نثار کو سمجھنے ساحر، ساحر کو سمجھنے کے لیے سدھا ملہوترا اور امرتا پریتم کو سنئے اور پڑھئے ساحر کی پرسنالٹی بڑی بجھی بجھی سی تھی چہرہ پر اداسی، آنکھوں میں مایوسی لیکن پھر بھی ویمنس کالج کی لڑکیاں اس کی دیوانی تھیں۔ان کی پہلی کتاب ''پرچھائیاں'' اس زمانے میں کالج کی لڑکیوں کے بیاگ میں ضرور ہوتی تھی مشاعروں میں وہ چھا جاتے تھے حالاں کہ کلام سنانے میں وہ کوئی خاص ''روچک'' نہیں تھے ان کی پرچھائیاں میں نے بھی پڑھی تھیں اس وقت میں سترہ برس کی تھی ان کی کتاب کی رونمائی کے فنکشن میں پاپا کے ساتھ میں بھی گئی تھی پاپا ہی نے اس کی رسم اجرا انجام دی تھی۔

مخدوم کو مخدوم بنانے میں ان کی بیوی کا کتنا دخل تھا میں نہیں جانتی مخدوم کے انتقال کے بعد جب میں ان کے گھر گئی پرسہ دینے کے لیے تو دیکھا ان کی بیوی اچھی خاصی گوری چٹی خاتون ہیں۔مخدوم کو مصروفیات جو ہمہ قسم کی تھیں انہیں ان کی بیوی نے ضرور سہا ہوگا۔

ہمارے اچھے دوستوں کی ایک کہکشاں تھی جس میں عالم خوندمیری، اختر حسن، غیاث صدیقی، مخدوم محی الدین اور مغنی تبسم۔ جب بھی ان میں سے کوئی ممبئی آتا تو ہمارے یہاں دھن راج گیر محل ضرور آتے۔ایک مرتبہ مغنی تبسم کے ساتھ جاوید اختر بھی آئے تھے ساحر کے ساتھ ایک لڑکا ساتھ آیا تھا وہ بھی شاعر تھا مجھے اس وقت اس کا نام یاد نہیں آرہا ہے اس سے گفتگو کے دوران اقبال

کا ذکر آ گیا بات چلتی رہی اس نے کہا' میں اقبال کو پسند کرتا ہوں لیکن ان کے ساتھ چل نہیں سکتا'' مجھے اس کی یہ بات اچھی معلوم ہوئی۔ کسی کی چھاپ قبول کرنے سے اچھا یہ ہے کہ اپنی چھاپ خود بنائیں۔

اردو، ہندی اور تلگو کے بڑے بڑے شاعروں سے عجیب وغریب ملاقاتیں رہیں۔ ششندر کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ بڑے شاعر ہوں گے۔ ایک شام ہم جئے پور میں ایک ریستوران کے ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے تھے چار پانچ لوگ اور بھی ہمارے ساتھ تھے ایک شخص آیا کرتا پاجامہ پہنے دبلا پتلا آدمی تھا۔ ششندر کو دیکھا تو تعجب سے کہا۔

''ارے ششندر جب سے تمہارا پتر آیا ہے کتاب کے ساتھ، تب سے میں تمہیں من ہی من میں پتر لکھ رہا ہوں، ہم دونوں چونکے اتنا بڑا Compliment دینے والا شخص آخر ہے کون، کچھ دیر باتوں کے بعد وہ چلے گئے تو لوگوں نے بتایا یہ ناگرجن ہندی کے بہت بڑے شاعر تھے۔

اسی روز شام میں ایک بڑا کوی سمیلن تھا جس کی ناگرجن صدارت کر رہے تھے۔ ہم وہاں ذرا دیر سے پہنچے۔ ششندر کو دیکھ کر ناگرجن نے انہیں اسٹیج پر اپنے ساتھ بٹھایا اور کہا آج کی شام ششندر کے نام دوسرے دن جئے پور یونیورسٹی کے کچھ پروفیسر اور دانشور ششندر سے ملنے آئے جئے پور یونیورسٹی کے فلسفے کے پروفیسر دیا سنگھ نے اپنے شعبہ میں ششندر کا ایک استقبالیہ رکھا، ششندر سنسکرت کے لوگوں سے سنسکرت ہی میں گفتگو کر رہے تھے کچھ لوگ وہاں اڑیسہ کے بھی تھے۔ ششندر نے جئے دیو کی سنسکرت نظم پڑھنا شروع کر دی۔ جلسے گاہ کے لوگوں نے تالیاں خوب بجائیں آ کے ملتے رہے بعد میں بہت خطوط بھی تعریف میں آئے۔ ان خطوط میں پوسٹل کارڈز بھی ہوتے تھے جو کوئی درزی لکھتا تھا، کوئی کولی، کوئی بس کنڈکٹر، ششندر ان سب کا جواب بڑی پابندی سے دیتے تھے میں سوچتی تھی یہ وقت کیوں خراب کر رہے ہیں انہوں نے کہا جب کسی ملک میں ایسے لوگ شاعری پڑھتے ہیں تو یہ سمجھو کہ اس ملک کا مستقبل اچھا ہو سکتا ہے شاعری انسان کے جذبات کو پاکیزہ بھی کرتی ہے اور مہذب بھی بناتی ہے۔ ان لکھنے والوں میں بڑے بڑے Writers بھی ہوا کرتے تھے۔

کبھی کبھی ان لکھنے والوں میں شاعری کا شوق بھی ابھر آتا تھا اپنی ٹوٹی پھوٹی شاعری بھی وہ لکھ دیتے تھے۔ ان کی ہمت افزائی کے لیے ششندر نے Poster Poems کا سلسلہ شروع کیا ایک بڑے سے کاغذ پر ان آئی ہوئی نظموں کو خود لکھتے تھے کبھی کبھی اپنی شاعری بھی شامل کر دیتے تھے اور ان لوگوں کو بھیجتے تھے جن کی نظمیں اس Poster میں شامل ہوا کرتی تھیں۔ جب بچوں کی یا نئے لکھنے والوں کی اچھی نظمیں آتیں انہیں اپنے دوستوں کو بھیجتے تھے تاکہ ان نئے شاعروں کی قدر دانی ہو سکے ان دوستوں سے خواہش کرتے تھے کہ ان نظموں کو اپنے دوستوں کو بھیجیں۔ اس طرح ایک Poetry Chain چلتی رہتی تھی۔

جب ششندر کی نظموں کے انگریزی ترجمے کتابی شکل میں آنے لگے تو ان کی بڑی پذیرائی ہوئی لوگ کہتے تھے چار آٹھ دن کے بعد جب وہ کتاب لیے ہم دکان پر جاتے تو کتابیں بک چکی ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں لوگ کتابیں پڑھتے تھے اچھی کتابوں کا Demand تھا۔

ہندوستان میں مصنف کو کبھی پیسے نہیں ملتے خود کتاب چھاپتا ہے اس کے پاس کتاب چھاپنے کے لیے پیسے بھی کم ہوتے ہیں ایک مرتبہ ششندر کو رائلٹی ملی تھی -/250 روپے۔ بس اس کے بعد وہ خود کتاب چھاپنے لگے ان کی کتابیں چھپنے لگیں۔ فروخت ہونے لگیں۔ تلگو والے پھر بھی کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔

ایک دن شام میں ہم بیٹھتے تھے ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ خبریں چل رہی تھیں دیکھتی کیا ہوں ششندر کی تصویر آئی اسکرین پر ابھی میں سوچ رہی تھی کہ کیوں آئی اتنے میں اناونس ہوا اس سال 1994ء کا تلگو میں ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ ششندر کو ملا ہے۔ اس سال تک ساہتیہ اکیڈیمی میں ریڈیوں کا گروپ تھا۔ ہر گروپ اپنے ہی لوگوں کو ایوارڈ کے لیے منتخب کرتا ہے۔ ہم دونوں دیکھتے رہ گئے ششندر نے کہا فون کر کے کہہ دو ''میں قبول نہیں کروں گا وہ کتاب تھی Kala Rekha تنقیدی مضامین کا مجموعہ تھا۔ میں سوچتی رہی رات کا وقت ہے کسے فون کروں؟ کیوں کروں؟ کیا کہوں۔ اتنے میں B.B.C. کا فون آیا۔ پوچھا آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں، جواب دیا اچھا محسوس کر رہا ہوں'' مجھے بہانا مل گیا میں نے ششندر کو سمجھایا جو ہو رہا ہے ہونے دو آپ کیوں انکار کر رہے ہیں۔ صبح D.C. میں این ۔ٹی۔راما راؤ کا ایک بڑا Message تھا Congratulation Sheshander for the services in Telugu Literature

جن دن ایوارڈ ملنے والا تھا ہم اور ہمارے کئی دوست دہلی پہنچے اکیڈیمی کا طریقہ ہے کہ ایوارڈ کے ایک دن پہلے آئیں۔ ایوارڈ کے بعد دوسرے دن ہوٹل چھوڑ دیں۔ اب اس بریکٹ میں اتنی دور کا سفر کر کے ہم تیسرے دن کیسے ہوٹل چھوڑ سکتے تھے تو ہم نے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں رہنے کے بجائے I.T.C. کی ہوٹل میسور، میں رہنا پسند کیا وہاں جانے پر لگا جیسے ایک چھوٹی سی کوٹھری میں ہم بند کر دیئے گئے ہیں میں دوسرے دن ہم ہوٹل اشوکا چلے گئے وہاں میں بورڈ آف ڈائریکٹرز میں تھی ۔ اچھا سا suite مل گیا تھا۔ جس روز ایوارڈ ملنے والا تھا جتنے لوگ دہلی میں تلگو والے تھے وہ سبھی چھٹی لے کر وہاں پہنچ گئے تھے ہندی اردو والے بھی تھے۔ ہال بھرا ہوا تھا مجھے سیڑھیوں پر بیٹھنا پڑا۔ ششندر پہلی صف میں تھے اشوک باجپائی کو بھی ایوارڈ ملنے والا تھا انہوں نے کہا ''اتنے لوگ'' میں نے بھی بڑے زعم سے کہا اگر ایوارڈ ششندر کو مل رہا ہے تو اتنے لوگ تو آئیں گے ہی۔ میں نے ششندر سے کہا آپ کو ایوارڈ مل رہا ہے تو آپ کے ساتھ کئی بڑے بڑے اور Writers کو بھی ایوارڈ مل رہا ہے۔ اس وقت ہندی میں اشوک باجپائی کو اردو میں مظہر امام کو ''پچھلے موسم کا پھول'' کے لیے کنڑ میں گریش کرناڈ کو مراٹھی میں دلیپ چترے کو ''ایکن کویتا'' پر انگلش میں Dom Moraes کو اس وقت کرشنا مورتی ساہتیہ اکیڈیمی کے صدر تھے۔

ششندر نے جب لکچر دیا تو کرشنا مورتی اور سب لوگ بہت متاثر ہوئے سکریٹری موہن نے آکر پوچھا آپ یہاں Meet the Author پروگرام میں شرکت کریں، تو ششندر نے یہ offer قبول کیا۔ ہم دہلی سے واپس آ گئے۔ کچھ دنوں بعد پھر دہلی سے بلاوا آیا۔ Meet the Author پروگرام اس کے لیے ششندر کو ایک آرٹیکل بھی لکھنا تھا۔ آرٹیکل تیار ہو گیا تھا۔ ششندر کو گوشوگر تھی ان دنوں شوگر بڑھ گئی پاوں کے انگوٹھے میں مواد بھر گیا۔ نامپلی کے ایک بڑے ہاسپٹل میں ان کا علاج چل رہا تھا وہیں بغیر بے ہوش کیے ان کے انگوٹھے کو ایک طرف سے کاٹ دیا گیا۔ درد بہت تھا پاوں سوج گیا تھا اس حالت میں دہلی جانا کیسے ہوگا مگر ششندر اٹل تھے کہا میں تو جاوں گا پھر ہم گئے۔ انٹرنیشنل سنٹر میں قیام ہوا۔ وہاں ہم سے ملنے میری ایک دوست آئی اس نے ششندر کی حالت دیکھ کر کہا ارنڈی کا تیل لگاؤ درد کم ہو جائے گا واقعی دوسرے دن سوجن بھی کم تھی اور درد بھی۔ جس شام Paper پیش کرنے والے تھے بہت خاص لوگ ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ششندر اسٹیج پر بیٹھے تھے۔ عنوان تھا "Poetry on Odyssey" جو بہت فکر انگیز تھا۔ اس موقع پر ایک بروچر بھی اکیڈیمی نے طبع کروایا تھا جس پر میری تصویر بھی تھی جو انتہائی غیر ضروری تھا۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ میری وجہ سے

ششندر کو یہ مقام حاصل ہوا جو بالکل غلط ہے۔ بلندی پر پہنچنے کے لیے سیڑھیاں تو چڑھنا ہی پڑتا ہے کبھی کبھی کسی سہارے کی ضرورت بھی پڑ جاتی ہے ان کو بھی یہاں تک پہنچنے کے لیے کئی امتحانوں سے گزرنا پڑا بہت سی کتابیں لکھنے سے کوئی Writer بڑا Writer نہیں بنتا کتنی اچھی کتابیں اس نے لکھی ہیں، کتنے لوگوں نے اسے پڑھا ہے اس کے قاری کتنے اور کیسے ہیں یہ ضروری ہوتا ہے۔ ہمارا ملک ہمہ لسانی ہمہ تہذیبی ملک ہے۔ Writer کے لیے ضروری ہے کہ وہ دو سے زیادہ زبانیں جانتا ہو، مختلف زبانوں کے Authors سے اس کی دوستی ہو ایک دوسرے سے ملتے رہیں۔ ہمارے یہاں کوئی کتاب نہیں خریدتا اگر کسی کے پاس بچاس روپے بھی ہیں تو وہ آج کوئی ناول جاسوسی ناول ڈرامے طنز و مزاح کی چیزیں پڑھ کر لطف اندوز ہونا چاہتا آپ کتاب 'نذر' بھی کریں تو شکریہ کے ساتھ لے گا۔ پھر بھول جائے گا کہ اسے پڑھنا ہے پھر کسی ردی کی دکان پر کتاب پہنچ جائے گی۔ ہندوستانی مصنف ایک کولی کی طرح اپنی کتابوں کا بوجھ اٹھائے رکھتا ہے پھر خود بھی کسی دن ردی والے کو اونے پونے بیچ دیتا ہے۔ جو لوگ اپنی ایک کامیابی پر اکڑنے لگتے ہیں وہ جلد ہی بھلا دیئے جاتے ہیں۔ پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا لکھنا نہیں چاہیے شاعر یا مصنف نہیں بننا چاہیے۔ اتنا آسان نہیں ہے کوئی Writer ہونا، مطالعہ وسیع ہونا ضروری ہے، دیگر زبانوں کی اچھی کتابیں پڑھنا انہیں جج کرنا بھی ضروری ہے۔ ششندر نے خود بھی محنت کی آخر فیلوشپ ہمارے گھر تک آئی۔ دوستوں کو دعوت دی جشن کا سا سماں تھا۔

جو لوگ بڑی آسانی سے سفارشوں سے خدمت گزاری سے دعوتوں سے وہسکی کی بوتلوں سے خوشامد سے چاپلوسی سے انعامات حاصل کرتے ہیں انہیں خود بھی خوشی نہیں ہوتی ہوگی کہیں نہ کہیں ان کا ضمیر بھی کچوکے لگاتا ہوگا۔ بڑے Writers ایسے گزرے ہیں دنیائے ادب میں جنہیں کوئی ایوارڈ نہیں ملا لیکن سماج نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ بڑا Writer اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ اسے ایوارڈ ملا کہ نہیں بڑے لکھنے والوں نے سماج کو بدلا ہے لوگوں کی سوچ کو بدلا ہے انقلاب لاتے ہیں دلوں میں جگہ بناتے ہیں۔

ششندر کے جانے کے بعد میں نے کچھ Endowments ادھر اُدھر دیئے ہیں یہ سوچ کر کے میری واپسی پھر سے یونیورسٹی میں ہوتا کہ کچھ ادب کی شاعری کی، تہذیب کی باتیں ہوں، بھولے ہوؤں کو یاد کریں ماضی سے حال کو حال سے مستقبل کو روشن کریں۔ نئی نسل سے مل کر نئی توانائی فکر و نظر کو دیں۔ اب عنقریب یونیورسٹی میں ایک آڈیٹوریم قایم ہو رہا ہے میری بڑی خواہش تھی ایسی جگہ کی جہاں میں ان کی چیزوں کو محفوظ کر سکوں۔ وہ جگہ تو نہ مل سکی مگر ایک ایسی جگہ ہے جو مرکز علم ہے وہاں ایک اڈیٹوریم بن گیا ششندر کے نام سے۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جو میرے خواب سے بڑی ہے۔

OOO

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو کا رسالہ ہے۔ جس کو کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی اعزازی کاپی طلب فرما کر ہمیں شرمندہ نہ کیجیے۔

رعائتی نرخ پر

ادیبوں و شاعروں کی کتابوں کے اشتہارات ''سب رس'' میں شائع کیے جاتے ہیں۔

سعیدہ بانو احمد

خودنوشت

ڈگر سے ہٹ کر

ہم لوگ اکتوبر ۴۴ء میں ممبئی گئے تھے۔اس سے چند مہینے پہلے آل انڈیا ریڈیو میں ایک نئے ڈائریکٹر آئے تھے جن کا نام تھا جگل کشور۔ممبئی سے واپسی پر انہوں نے ہم لوگوں سے میل جول بڑھایا۔ ہمارے گھر آنے جانے لگے۔ ابن سے بے حد ہمدردی، بچوں سے خوب دوستی کر لی اور بیگم اختر اور اشتیاق بھائی کو بھی اپنے حس اخلاق کے دائرے میں لے لیا۔ اب ہم لوگوں کا ایک گروپ سا بن گیا اور شام کو روز ہی اشتیاق بھائی کے یہاں محفل جمتی۔ اختری ابن میاں کو ہاتھوں ہاتھ لیتیں۔ بڑی خاطریں کرتیں۔اور اپنی دلکش ہنسی سے ہم سب کا دل خوش کرتیں۔

اشتیاق بھائی چٹکلے چھوڑتے رہتے اور سب کو خوب ہنساتے۔جگل صاحب کی بھی اچھی شخصیت تھی۔لہجہ پنجابی تھا۔اردو جانتے تھے لب کشائی کرتے تو محفل کی رونق میں اور بھی کچھ اضافہ کر دیتے۔ابن اشارتاً بھی کہہ دیتے کہ ان کا سر دکھتا ہے تو اختری ان کا سر دہانے لگتیں۔نفسیاتی طور پر ابن کو یہ سب بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔

ریڈیو میں جگل کشور صاحب اکثر میرے کمرے میں آ بیٹھتے خود نہیں آتے تو چائے کا پیالہ میری میز پر رکھا نظر آتا۔اکثر یہ بھی ہوا کہ میں نے ریڈیو کے پورچ میں اپنی گاڑی کھڑی کی اور جگل صاحب نے آگے بڑھ کر میری کار کا دروازہ کھولا۔ یہ توجہات مجھے قدرے ناگوار گزرنے لگیں مگر یہ کھائے کھیلے مرد تھے فوراً ایسی باتیں کرتے کہ میں الٹی محظوظ ہونے لگتی۔

شام کو کاشانہ رضا میں یا بیگم اختر کے یہاں ہم لوگ جمع ہوتے اور دو چار گھنٹے خوشگوار گزر جاتے۔تصویر کا ایک پہلو یہ تھا اور دوسرا وہی تھا کہ ابن دل برداشتہ رہتے۔ ہمارا مشترکہ خاندان تھا۔ نیچے میری ساس رہتی تھیں۔ان کے آدھے درجن رشتے دار تھے جو ہمیشہ ادل بدل کے بیگم رضا کے مہمان رہتے۔ایک تھے حامد دادا جو بیگم رضا کے منشی بھی تھے اور ان کے قریبی عزیز دار بھی۔صبح یا شام کو بیگم رضا سیڑھیاں چڑھ کر اپنے بیٹے سے ملنے ان کی خیریت پوچھنے اوپر آتیں۔صبح آتیں تو یہ غسل خانے سے نہیں نکلتے اور نکلتے تو بس اتنا وقت رہ جاتا کہ مشکل سے ناشتہ کر سکیں۔ان کی ماں بیٹھی انتظار کرتی رہتیں۔ یہ نکل کر ماں کو آداب کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔اگر وہ پوچھ اٹھتیں کہ کیسے ہو بیٹے تو جواب ندارد۔

میں روز کے معمول میں فرق نہیں آنے دیتی تھی۔ بچوں کو بھی سمجھا بجھا کر بہلائے رکھتی تھی اور روز صبح نیچے جا کر ساس کو اور دوسری بڑی بوڑھیوں کو آداب کر آتی تھی۔

شام کو اگر کسی دن ہم لوگ بیگم اختر سے نہیں ملتے تو یہ اپنے کمرے میں جا کر سو جاتے بچوں کو میں آٹھ بجے کھانا کھلا کر سو جانے کا پابند کر چکی تھی۔ وہ معمول کے مطابق سونے چلے جاتے۔ رفتہ رفتہ ابن صاحب نے یہ ڈھنگ بنا لیا کہ جہاں تک ہوتا نہ میرے ساتھ ناشتہ کرتے نہ رات کا کھانا کھاتے۔بچوں کے سامنے دکھاوے کے لیے یہ بڑی کوشش سے میری موجودگی روا رکھتے۔ ماں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ بنا لیا اور عزیز رشتہ دار تو خیر کسی گنتی میں نہیں تھے۔ان کے دو بڑے بھائی لکھنو میں موجود تھے۔انہوں نے کبھی کوئی دلچسپی یا ہمدردی کا اظہار نہیں کیا نہ کبھی آ کر اپنے بھائی کے پاس بیٹھے نہ مجھ سے اور اپنی ماں سے ابن کے حالات کے بارے میں اپنی تشویش دکھائی۔کسی کو کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔بس ابن کی ماں اور میں اندر ہی اندر گھلے جا رہے تھے۔ کپورتھلہ ہاؤس میں میری بہن اور میری ماں رہتے تھے وہ البتہ پریشان تھیں میری بہن

ابن کے پاس آتیں۔ ابن کو ان کا آنا ناگوار نہیں ہوتا تھا۔ دونوں کافی محبت اور خلوص سے ملتے اور میں خوش ہوتی کہ چلو کسی کے ساتھ تو یہ کھلے دل سے ملتے ہیں۔ اس کے پس پشت یہ بات کارفرما تھی کہ ابن جانتے تھے کہ میری بہن اکثر مجھ سے چڑھ جاتی ہیں۔ ڈانٹ بھی دیتی ہیں۔ وہ مجھ سے بارہ سال بڑی تھیں۔ میں ان کی ڈانٹیں کھانے کی عادی تھی۔ وہ مجھے چاہتی بھی بہت تھیں ساتھ ہی میری بہت سی باتیں ان کو پسند نہیں تھیں میں بالکل دنیادار نہیں تھی وہ تھیں۔ مجھے سمجھاتی رہتی تھیں کہ تم پھوہڑ ہو۔ بچوں کے کپڑے ٹھیک نہیں رکھتی ہو۔ گھر کے انتظام میں نوکروں سے بہت نرمی برتتی ہو وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے یہ کہ وہ شروع سے ہی ابن کی بہت خاطریں کرتی تھیں اور دل سے چاہتی تھیں کہ میری شادی بنی رہے۔ میری بہن کا اور میری ماں کا فکر سے بُرا حال تھا۔

ممبئی میں علاج کے سلسلے میں روپیہ کم پڑ گیا تھا تو میں نے اپنی ماں کو ٹیلی فون کیا تھا اور انہوں نے مجھے دو ہزار روپے بھیجے تھے جو میں کبھی ادا نہیں کر سکی۔ کہنا چاہتی ہوں کہ میری بہن کی میری مخالفت کی بنا محبت کی بنا تھی۔ کسی Complex کے تحت نہیں تھی۔

میرے گھر کی فضا اس درجہ مکدر تھی کہ میری ہمتیں جواب دے رہی تھیں۔ دل اس قدر ڈوبتا کہ کھانا پینا دوبھر ہو گیا تھا۔ کئی کئی دن بے کھائے پیئے گزار دیتی۔ بچوں کے ساتھ دکھانے کے لیے کبھی ایک ٹوسٹ کھا لیا کبھی چائے پی لی۔ پھر یکا یک ابن کا موڈ بدلتا۔ وہ خود سے میرے پاس آتے معافیاں مانگتے اور گھڑی گھڑی یہی کہتے کہ میری طبیعت اچھی نہیں رہتی ہے اس لیے ایسا ہو گیا ہوں۔ خود بھی روتے میں بھی روتی۔ وعدے وعید ہوتے۔ پھر کچھ دن اچھے گزر جاتے۔ اختر، اشتیاق، جگل کشور ابن ہم سب پھر مل بیٹھتے۔ اشتیاق بھائی ابن کو پہلی ملاقات کا بادشاہ کہا کرتے تھے۔

ادھر آفس میں جگل صاحب کی مہربانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ جب میں کئی کئی دن فاقہ کشی کی حالت میں دفتر جاتی تو یقیناً چہرے کا رنگ کچھ بدلا ہوا تو ہوتا پھر یہ ہونے لگا کہ چپراسی نے آ کر کہا کہ آپ کو بڑے صاحب بلا رہے ہیں۔ میں جاتی تو وہاں باقاعدہ چائے لگی ہوتی۔ کیک پیسٹری وغیرہ وغیرہ۔ وہ خود بھی کھاتے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کو بھی بلا لیتے۔ اچھی خاصی پارٹی ہو جاتی اور میں کچھ تو کھا ہی لیتی تھی۔

گھر کی فضا میں مجھ پر فاقے گزرتے تھے اور آفس میں جگل صاحب اکثر سموسے پکوڑے کیک وغیرہ کی پارٹیاں کرتے رہتے۔ ان تمام حالات میں میں نے زبان نہیں کھولی تھی۔ میں نے کسی سے اپنا دکھڑا نہیں رویا نہ جگل صاحب سے اپنے نجی حالات کا ذکر کیا۔ جگل ایک گھاگ آدمی تھے۔ گھر بھی آتے تھے۔ یہاں کے حالات کو بھی بھانپتے رہتے تھے اور شام کو محفلوں میں بھی اپنے انداز لگاتے رہتے ہوں گے۔ آخر ایک دن انہوں نے اعلان کر ہی دیا کہ مجھ پر جان چھڑکتے ہیں۔ میں پہلے تو سناٹے میں آ گئی پھر سنبھل کر میں نے کہا کہ دیکھئے میں شادی شدہ عورت ہوں۔ میرے دو بچے ہیں۔ ہماری راہیں الگ ہیں میں آپ کو دوستی کی قدر کرتی ہوں۔ یہیں تک رہنے دیجئے جہاں دیدہ جگل صاحب نے پھر مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ دفتر جاتی تو ان کی مہربانیاں اور توجہ میں کمی نہیں ہوتی گھر پر آ کر ابن کے ساتھ ان کا اخلاق اور ہمدردی بھی ویسی ہی قایم رہی۔ ابن سیدھے انسان تھے۔ معاملہ کی تہہ تک پہنچنا ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جگل صاحب نے پھر داستان دل بہت محتاط لفظوں میں بیان کی اور کچھ مشورہ بھی دینا چاہا۔ اب دل ہی دل میں میں بھی ان کے خلوص کی قایل ہونے لگی تھی۔ اور دفتر میں ان کی توجہ مجھے ناگوار نہیں ہوتی تھی۔ گھر کے ماحول میں اتنے دکھ اور بدمزگی گھلی ہوئی تھی کہ باہر کی فضا میں سانس لینا بھی اچھا معلوم ہونے لگا تھا۔ چہ جائیکہ کسی شخص کا یوں واری

نیاری ہونا۔ مگر دل میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ (ہاں احساس جرم ابھر رہا تھا کہ یہ میں کیا کر رہی ہوں۔ ایک غیر مرد کے لیے دل میں جگہ پیدا ہونا! کیا غضب ہے! میں تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئی ہوں) غرض کہ جملہ مصیبتوں کے ساتھ میرے کیریکٹر کی مضبوطی بھی کمزور پڑ رہی تھی۔ جس کے سہارے میں سر اٹھا کر چل سکتی تھی۔ میری تربیت میں اس قدر زور دیا گیا تھا اس بات پر کہ دل پر کچھ بھی گزرے روز کے فرائض پورے ہوتے رہیں۔ جب رونا آئے تو ہنسنا سیکھو۔ محض اس تربیت کے سہارے میں نے روز کے کاموں میں فرق آنے دیا۔ ورنہ عالم تو یہ تھا کہ سر جھکا جا رہا تھا۔ نگاہ اوپر اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ ابن نے مجھ میں یہ تبدیلی ضرور محسوس کی ہوگی۔ اب جہاں ہم دونوں اکیلے ہوتے وہ خود کو کمرے میں بند کر لیتے ہماری دوری بھیانک بنتی جا رہی تھی۔

ایک دن ابن خود سے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میں سول ججی سے استعفیٰ دینا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ ایسا نہ کیجئے آپ کی بینائی میں جو فرق آیا ہے تو اتنا ہی تو ہے کہ آپ کو پڑھنے لکھنے کو منع کیا گیا ہے تاکہ آنکھ پر زور نہ پڑے۔ آپ ایک منشی رکھ لیجئے اسے اپنے فیصلے لکھا دیا کیجئے۔ ابن سن کر خاموش ہو گئے۔ پھر ایک دن معلوم ہوا کہ ابن نے سیول ججی کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کہا کیوں کہ اب کہنا سننا بیکار رہی تھا یہ فکر ضرور ہوئی کہ ابھی تک تو کچہری جاتے تھے اب کوئی شغل نہ ہوگا تو یہ کیا کریں گے۔ کچھ دنوں میں میرے اندیشے سامنے آنے لگے۔ یہ اور زیادہ زود رنج ہو گئے۔ ان کی رنجش کا شکار بس ہم ہی دو ہوتے تھے۔ ان کی ماں اور میں باقی کے رشتے دار زیادہ تر تو ایسے تھے جو مہمان کے طور پر کاشانہ رضا میں رہتے تھے۔ وہ آپس میں جو چاہیں چہ می گوئیاں کریں لیکن دراصل وہ ابن صاحب کے غصے سے اتنا ڈرتے تھے کہ سامنے آنے سے کتراتے تھے۔ بھائیوں میں ایسا ناطہ ہی نہیں تھا کہ وہ پوری طرح ہماری مصیبتوں کو اپنی مصیبت بنا لیں۔ میری بہن اب زیادہ آنے لگیں۔ ابن کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے کر چلی جاتیں۔ بیگم اختر اور اشتیاق بھائی نے بھی آنا جانا زیادہ کر دیا۔ ان کے ساتھ جگل صاحب بھی پہنچ جاتے۔

میرے دل میں جو چور تھا۔ اسے مضبوطی سے پاؤں جمانے میں مشکل ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں کیوں جگل صاحب کی توجہ تو اچھی معلوم ہوتی لیکن وہ جو سبز باغ مجھے دکھاتے رہے تھے وہ کھوکھلے محسوس ہوتے۔ جگل کی ایک عادت تھی کہ وہ نگاہ سے نگاہ ملا کر بات نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ آپ بنگلور چلی جائیے۔ بچوں کو لے کر۔ وہاں میرے ایک دوست ہیں۔ وہاں قیام کیجئے پھر میں آ جاؤں گا وہاں۔ میں نے ان کی شکل دیکھی کہ یہ خدا جانے مجھے کیسی عورت سمجھ بیٹھے ہیں، میں تو اپنے مسائل کو سلجھانے اور ان سے مفاہمت کرنا چاہتی ہوں، میں راہ فرار نہیں ڈھونڈھ رہی ہوں۔ میرے دل میں جگل صاحب کے لیے جو جذبہ ابھر رہا تھا اس سے میں نبرد آزما تھی اور دور دور یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میں ابن کو چھوڑ کر کہیں جا سکتی ہوں۔ ریڈیو میں مشکل سے دو گھنٹے کے لیے جاتی تھی۔ اب جب کہ ابن گھر پر رہتے تھے ہر وقت۔ میرے لیے ریڈیو میں دو گھنٹے بھی گزارنے مشکل ہوتے۔ میرے اور میرے شوہر کے درمیان پھر سے عہد و پیمان ہوئے اور ہم نے نئی صورت حال کو سنبھالنے کے پروگرام بنائے۔ یہ باغ میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ بیگم رضا کے آم اور امرود کے باغات تھے جن کی دیکھ بھال حامد دادا کرتے تھے۔ وہ خورد برد کر کے آمدنی بہت کم دکھاتے تھے۔ ابن نے ارادہ ظاہر کیا کہ ہم دونوں جا کر خود ان باغات کی نگرانی کریں اور اندازہ لگائیں کہ کیا بہتری ہو سکتی ہے۔ کچھ دن خاصے گزر گئے۔ مگر کم بخت بنیادی فطرت کا براہوان کے موڈ پھر ان پر حاوی ہونے لگے۔

میرے ساتھ انتہائی محبت کے بعد مجھے دھڑ سے تحت الثری میں گرا دینے کی ان کی پرانی عادت تھی۔ میں نے ان سے کئی

باران کی اس عادت کے بارے میں باتیں کی تھیں کہ یہ نہ کیا کیجئے کیوں کہ آپ جب چند منٹوں میں مجھے ذلت کے گڑھے میں گرا دیتے ہیں اور بعد میں مجھے مناتے ہیں معافیاں مانگتے ہیں تو میں من بھی جاتی ہوں اور معاف بھی کر دیتی ہوں لیکن اگر ایسے ذہنی طوفان آئے دن آتے رہیں تو وہ اپنا اثر ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔ دلوں میں دوری ہونے لگتی ہے اور میاں بیوی کے رشتے کی بے ساختگی اور سادگی ختم ہو جاتی ہے۔

مرد کی انا اور زمانے نے مرد کو جو اختیارات دے رکھے ہیں ان میں یہ تو شامل ہے کہ عورت کو جب جی چاہے ذلیل کر لیں۔ مگر عورت منجمد ستون کی طرح اپنے سر تاج کے سامنے سر اٹھا کر یہ نہ کہے کہ

''ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں''

میں یہ سب کچھ برداشت کر رہی تھی اپنے بچوں کی خاطر اور اس امید میں کہ شاید ابن خود ہی سنبھل جائیں۔ خود ان کے حق میں مزاج کا یہ تلاطم زہریلا تھا۔ اس کا اثر سارے خاندان پر پڑ رہا تھا۔ میرے بچے بڑے ہو رہے تھے۔ ماحول میں تناو وہ بھی محسوس کر رہے ہوں گے۔ اب ایک امداد غیبی یہ ہوئی کہ جگل کشور کا تبادلہ دلی ہو گیا۔ یہ اگست ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ جگل صاحب نے پھر سبز باغ دکھائے کہ آپ بنگلور چلی جایئے۔ میں وہاں آجاؤں گا۔ باوجود کہ جگل کے لیے میرے دل میں ایک انسیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور میں سکتے کے عالم میں ان کے مشورہ سنتی رہتی لیکن ان کے جاتے ہی ان کی باتیں اپنا اثر کھو بیٹھتیں اور مجھے محسوس ہوتا کہ ''میں اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتی۔ میں اپنے بندھن توڑ نہیں سکتی ہوں۔ میں اپنے بچوں کو چھوڑ نہیں سکتی''۔ ادھر گھر میں یہ حال تھا کہ ابن کی اپنی ماں کی طرف سے ناراضگی اور بیزاری اور میری طرف سے کدورت کا اظہار زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ بہر حال زندگی گزرتی رہی یہ کبھی بالکل نارمل ہو جاتے اور ایسا محسوس ہوتا کہ یہ آزمائش کے دن کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائیں گے۔ زندگی پھر مسکرائے گی۔ لیکن ''من درجہ خیالیم وفلک درچہ خیال'' کا مضمون ہوا۔ ہمارے درمیان ناچاقی ہمیشہ کسی چھوٹی سی بات پر ہوتی تھی اور پھر وہ پہاڑ بن جاتی تھی۔ ایک دن ایسا ہی ہوا۔ یہ مجھ سے بگڑے کسی بات پر آدھی رات کا وقت تھا۔ میرے اعصاب پر بھی اتنا بوجھ تھا کہ میں بھی بگڑ بیٹھی۔ ہماری آوازیں اونچی ہونے لگیں۔ اور میں نے کوئی ناگفتہ بات کہہ دی ہوگی یہ آپے سے باہر ہو گئے اور فوراً اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں اپنے پلنگ پر پڑی روتی رہی۔ پھر یقیناً آنکھ لگ گئی ہوگی۔ جب جاگی تو صبح ہو چکی تھی۔ میں نے جلدی جلدی بچوں کو تیار کیا۔ اسکول پہنچایا۔ واپس آئی تو خانم آیا سے پوچھا کہ صاحب اٹھے ناشتہ واشتہ کیا۔ کہنے لگی کہ ابھی تو وہ کمرے سے باہر ہی نہیں آئے ہیں۔ مجھے تشویش ہوئی میں نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر دیکھا تو یہ وہاں نہیں تھے۔ پوچھ گچھ کی تو سب نے یہی کہا کہ ابھی تو صاحب باہر آئے ہی نہیں۔ میں نے اپنی بہن کے یہاں آدمی بھیجا تو معلوم ہوا کہ وہاں بھی نہیں ہیں۔ سکندر باغ گھر کے بالکل سامنے تھا۔ خیال ہوا کہ شاید ٹہلنے گئے ہوں۔ پوری صبح میں نے اس ادھیڑ بن میں گزار دی کہ کہیں گئے ہوں گے آجائیں گے دوپہر ہو گئی تو میں نے اشتیاق بھائی کے یہاں ٹیلی فون کیا وہاں سے بھی یہی جواب ملا کہ نہیں یہاں تو نہیں آئے۔ بھائیوں سے اتنی بے تکلفی نہیں تھی کہ میں سوچتی کہ شاید وہاں چلے گئے ہوں۔ اب میری فکر بڑھی۔ شام ہوتے ہوتے سارے گھر کو معلوم ہو گیا کہ ابن صاحب گھر میں نہیں ہیں۔ میری ساس بیگم رضا ہانپتی کانپتی سیڑھیاں چڑھ کر آئیں۔ ''دلہن ابن کہاں چلے گئے'' انہوں نے روہانسی ہو کر پوچھا ''مجھے نہیں معلوم چچی جان۔'' میں ایک مجرم کی طرح ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ پرانی وضع کی بے آسرا خاتون بے حد جذباتی خاموشی سے آنسو بہانے والی بی بی وہ رو رہی تھیں۔ ان کا بیٹا لاپتہ تھا۔ سارا دن گزر چکا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں

آ رہا تھا کہ میں کیا کہہ کر تسلی دوں۔ ہم دونوں نے ان کے کمرے میں جا کر دیکھا تو ایک چھوٹا سوٹ کیس غائب تھا۔ الماری کھولی۔ جاڑے کے ایک دو سوٹ چند پیجامے کرتے۔ ایک گرم کوٹ غائب تھا۔ اب ہم لوگ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ لکھنو سے باہر گئے ہیں۔ مگر کہاں کس کے پاس؟ بھوپال میں نے اپنے بھائی کو ٹیلی فون کیا۔ انہوں نے قطعی لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ نہیں یہاں تو نہیں آئے۔ میں اب کیا کروں۔ بیگم رضا مجھ سے مختلف سوالات کرتیں اور روتی جاتیں میں مجرم کی طرح بس یہ کہتی جاتی کہ ''مجھے نہیں معلوم'' بات پھیل گئی۔ اب دونوں کی بوچھار۔ میری بہن مجھ پر برس پڑیں کہ بتاتی کیوں نہیں ہو کہ کیا ہوا؟ میری خاموشی پر وہ اور برگشتہ ہوئیں۔ ڈانٹنے پر اتر آئیں اور میں نے پھر وہی جواب دیا کہ ''مجھے نہیں معلوم۔'' میری والدہ آئیں انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ خاموش بیٹھی رہیں بچے میرے ان سے بہت مانوس تھے۔ انہیں لے کر وہ اپنے گھر چلی جاتیں۔ میرے جواب سے کسی کو تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ میں کچھ چھپا رہی ہوں۔ جب کہ میں کچھ نہیں چھپا رہی تھی۔ لڑائی تو آئے دن ہو جاتی تھی۔ سارے گھر کو معلوم ہو جاتا کہ ابن مجھ سے خفا ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیتے تھے۔ کبھی دھڑام سے بند کرتے تھے۔ کبھی بس یوں ہی سارے نوکر یہ تماشا دیکھتے تھے۔ میری ساس کی رشتہ دار بیبیاں بھی کھسر پھسر کرتیں لیکن جب میرے منہ سے کوئی کچھ سنتا ہی نہیں تھا تو کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ اس کا چرچا کریں۔ اس تلاطم میں بھی میں روز کے معمول میں فرق نہیں آنے دے رہی تھی۔ بچے سوالات کی بوچھار کرتے رہتے اور میں طرح طرح سے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتی Home Work اور کھیل کود میں لگائے رکھتی۔ لیکن دل ڈوبتا رہتا۔ طرح طرح کے وسوسے گھیرنے لگے۔ یا اللہ یہ کہاں گئے۔ مجھے دہرہ دون کا وہ دن یاد آیا۔ جب میرے پیٹ میں بچہ تھا۔ میری طبیعت بہت خراب رہتی تھی۔

میری شادی کو سوا سال ہوا تھا۔ یہ دو دن کی چھٹی لے کر مجھ سے ملنے دہرہ دون آئے تھے۔ میں اپنے والدین کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ اگست کا مہینہ تھا۔ ہم لوگ برآمدے میں سو رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے میں نے کی ہوگی کوئی مخالفت۔ ہاں میں ہاں نہ ملائی ہوگی اور یہ ناراض ہو کر چپل پہنے ہوئے کمپونڈ سے باہر نکل گئے تھے۔ کافی انتظار کرنے کے بعد جب یہ نہیں آئے تو میں سڑکوں ان کو ڈھونڈنے نکلی تھی دو سڑکیں پار کر کے تیسری سڑک پر لیمپ پوسٹ کے نیچے ایک آدمی دکھائی دیا تھا اور میں اندازے سے ان کے نزدیک گئی دیکھا تو یہی تھے۔ پھر میں ان کو گھر لائی تھی۔ اس دن میں اگر ڈھونگ رچاتی تو شاید ان کی سمجھ میں آتا کہ یہ ان کی کس قدر غیر ذمہ دارانہ حرکت تھی۔ مگر میں کیا کروں اپنی جرأت اور ہمت اور اپنی قوت برداشت کو کہاں لے جاؤں جس نے حالات کا مقابلہ کرنا سکھایا تھا۔ گھبرا کر میرے ہاتھ پیر نہیں پھول جاتے تھے۔ آج بھی وہی کر رہی ہوں۔ میری ساس دن بھر جائے نماز پر بیٹھی رہتیں۔ دعائیں مانگتیں۔ روتیں۔ میرے پاس آ کر بیٹھتیں مگر اپنے کسی جملے یا اشارے کنائے سے بھی انہوں نے مجھے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ مجھے مورد الزام قرار دیتی ہیں ان کی شفقت بدستور قایم رہی۔ میں شکر گزار ہوں اپنی ساس اور اپنی ماں کی۔ ان دو بزرگ بیبیوں نے اپنے دکھ کو اپنے اپنے ڈھنگ سے برداشت کیا اور جہاں تک بن پڑا مجھے ڈھارس دی۔ یہ دونوں خواتین تعلیم یافتہ نہیں تھیں۔ اردو میں معمولی شد بد رکھتی تھیں۔ ساری زندگی پردے میں گزری تھی۔ اپنی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کے لیے انہیں مرد کے سہارے کی ضرورت تھی۔ لیکن صدیوں کی معاشرت کی جو ٹھوس قدریں تھیں انہیں گلے سے لگائے ہوئے تھیں۔ طرح طرح کے عزیزوں رشتہ داروں سے نباہ، بہوؤں کی غیریت، الگ الگ رہنے کی خواہش، بے نیازی، ان کی کم عمری کا الھڑ پنا میری ساس ان ساری کیفیتوں کو اپنی شفقت میں سمیٹ لیتیں اور میں نے آج تک ان سے اپنی

کسی بہو کی شکایت نہیں سنی تھی۔ اس وقت بھی وہ کس قدر بے چین تھیں، اس کا اظہار ان کے آنسوؤں سے ہوتا رہتا تھا۔ لیکن زبان سے انہوں نے کوئی کلمہ ایسا نہیں نکالا جس سے مجھے دکھ پہنچے۔ وہ مجھے واقعی دل سے کوئی الزام نہیں دے رہی تھیں۔ انہیں جتنا میرے حال کا اندازہ تھا وہ گھر میں کسی کو نہیں تھا۔ دن گزر رہے تھے اور اب ہر ایک اس نتیجے پر پہنچ رہا تھا کہ انہوں نے خودکشی کر لی ہے۔ اب مجھے بالکل یاد نہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں بچوں کو کیسے سنبھالتی رہی۔

الفاظ نہیں ہیں میرے پاس کہ اپنی کیفیت بیان کروں کہ ایک ایک لمحہ کیسے گزر رہا تھا۔ کیا کھا رہی تھی کیسے سو رہی تھی، میرے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے مگر وقت عجیب چیز ہے گزر ہی جاتا ہے۔ ہوتے ہوتے دو ہفتے نکل گئے۔ ایک صبح تار والے نے گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر میں خانم ایک تار لے کر میرے پاس آئیں۔ تار بھوپال سے آیا تھا۔ میرے بھائی نے لکھا تھا۔ ابن میرے پاس ہیں۔ کل پہنچے ہیں۔ میں دبکی سہمی اپنی ساس کے پاس گئی تار کا مضمون پڑھ کر سنایا۔ وہ پہلے سے ہی مصلے پر بیٹھی ہوئی تھیں مجھے دعائیں دیں اور پھر نہ جانے کتنے شکر کے سجدے کیے۔

میرے اوپر یہ دو ہفتے جیسے گزرے تھے اس میں یہ مسئلہ گھڑی گھڑی ذہن پر چھا جاتا تھا کہ میں کیا کروں۔ اگر ابن نہیں ملے تو اس قیامت کو کیسے برداشت کروں گی۔ اب جو یہ خبر ملی کہ وہ خدا کے فضل سے صحیح سلامت ہیں تو دل ہی دل میں ہزاروں شکر کے سجدے میں نے بھی کیے۔ لیکن ساتھ ہی اس کا احساس بھی ہوا کہ اب ابن اور میرے درمیان کی خلیج پاٹی نہیں جا سکتی۔

ہمارے تعلقات جب زیادہ خراب ہونے لگے تھے تو میں نے BBC میں ملازمت کی درخواست لندن بھیجی تھی Disc پر میری آواز بھی گئی تھی اور کچھ عرصے بعد BBC سے میرے نام ایک خط بھی آیا تھا جس میں ملازمت کی درخواست منظور کر لی گئی تھی اور مجھ سے وہاں Join کرنے کے لیے لکھا تھا۔ وہ خط ابن کے ہاتھ پڑ گیا اور انہوں نے بالا بالا لکھ دیا تھا کہ میں ان کی بیوی ہوں اور ان کی اجازت کے بغیر میں B B C کی نوکری نہیں کر سکتی۔ تو یوں BBC میں ملازمت کا امکان تو ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔ ریڈیو کی نوکری تھی جس میں مجھے ڈیڈھ سو روپیہ مہینہ مل رہا تھا۔ اس قدر قلیل رقم میں میں کیا کر سکتی تھی۔ اس درمیان میرے بھائی کا مفصل خط آ گیا۔ اس میں میرے لیے نصیحتیں تھیں اور ساتھ ہی یہ کہ فی الحال ابن بھوپال ہی میں رہنا چاہتے ہیں۔ یہ بات ہے فروری ۴۷ء کی میں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ اناونسر کی نوکری کی درخواست دلی بھیج دی اور Disc پر اپنی آواز بھی۔

میری نیا بھنور میں نہ آ گئی ہوتی تو میرے بچے اپنی اپنی جگہ خوش تھے ان کے چاروں طرف نانی دادی خالہ پھوپھی اور چچاؤں کی محبتیں انہیں اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھیں۔ ہماری ازدواجی زندگی کا کھنچاؤ نانی دادی کی نرم و گداز محبتوں میں گھل کر ہموار ہو جاتا تھا۔ بچوں کی آیا خانم اس قدر محبتی، مستعد اور سمجھ دار تھی کہ اس کا وجود ہی بچوں میں سلامتی اور بھروسہ پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ مگر اب کیا کروں اب تو شیرازہ بکھر گیا ہے۔ میری معاون اور مددگار تین عورتیں جو کچھ کر نہیں سکتی ہیں، خاموش ہیں۔ مگر ان کی خاموشی میری ہمت اور قوت کو مضبوطی بخش رہی ہے۔ ساس اور ماں نے قدیم معاشرت کی جکڑ بندی میں رہ کر اپنی شخصیت بنائے رکھی اور فطری روشنی طبع کو دھندلا نہیں پڑنے دیا۔ سچائی اور سادگی کے ساتھ وہ خاندان میں ایک مضبوط ستون بنی رہیں۔

ان خواتین نے میرے اس فیصلے کو ''میں کاشانے میں نہیں رہوں گی۔'' ایسے سنا جیسے کہ ''یہی ایک صحیح فیصلہ ہے''۔

OOO

رینو بہل

افسانہ

''مجھے کیا بُرا تھا مرنا''

شام پانچ بجے وہ سج سنور کر پون کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگی۔ اُس نے خاص پون کی پسند کی نیلے آسمانی رنگ کی سِلک کی ساڑھی پہنی تھی۔ حالانکہ اُسے ساڑھی اچھے سے باندھنی بھی نہیں آتی تھی پھر بھی اُس نے اپنی نند کی مدد سے اُسے سلیقے سے پہنا تھا۔ بال سنوار کر بنائے تھے۔ میک اپ کی اُسے ضرورت ہی نہیں تھی۔ نکھری ہوئی سفید رنگت، بھرے بھرے گلابی رخسار، لال گلاب کی پنکھڑی جیسے نازک ہونٹ، کالی بڑی بڑی آنکھیں اور اُس پر کاجل کی لکیر، ماتھے پر سجی گول بِندیا اور دونوں کلائیوں میں میچنگ نیلے آسمانی رنگ کی کانچ کی چوڑیاں۔

رما اپنی بھابھی کی خوبصورتی اور سادگی دیکھ کر دل ہی دل میں نہال ہو رہی تھی۔ کمی تھی تو بس ایک چیز کی۔ اس کے چہرے سے جذبات کے رنگ کبھی نظر نہیں آئے۔ چہرہ ہمیشہ سپاٹ ہوتا کورے کاغذ کی طرح۔ دو موٹی موٹی کالی دلکش آنکھیں بولتی نہ تھیں صرف اِدھر اُدھر سب نہارتی تھیں۔ کبھی کبھی ان آنکھوں میں خوف کی جھلک نظر آتی یا پھر شاید یہ احساسِ کمتری تھا۔

صبح کام پر جاتے وقت پون نے اُس سے کہا تھا ''شام کو تیار رہنا فلم دیکھنے چلیں گے''۔

اور وہ شام ہونے سے پہلے ہی گھر کے سب کام نبٹا کر تیار ہوگئی۔ انتظار کی گھڑیاں کاٹے سے نہیں کٹ رہی تھیں۔ کبھی وہ کمرے میں آ کر ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتی تو کبھی ساس کے پاس جا بیٹھتی۔ شام کے سائے پھیل کر رات کے اندھیرے میں سمٹ گئے۔ آسمان پر چاند چمکنے لگا اور ستاروں کی محفل روشن ہوگئی مگر اس کا چاند نہ جانے کس بدلی میں چھپا تھا کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ فلم شروع کیا اب تو ختم ہونے کا وقت آ گیا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اُٹھ کر کپڑے بدل لے کہ ساس نے اپنے کمرے سے آواز لگائی:

''بہو اگر کھانا تیار ہو گیا ہو تو ہمارا کھانا لگا دے''۔

''جی امّاں جی''۔

اتنا کہہ کر وہ اٹھی۔ آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔ اپنے عکس کو سراپا نہارا اور سوچنے لگی ''کتنی بدل گئی ہوں میں۔ کیا فائدہ اتنا سجنے سنورنے کا جس کے لئے اتنا ہار سنگھار کیا اُسی نے ہی نہ دیکھا''۔

بے قرار دل میں اُمڈتے سیلاب کو اُس نے رہا کر دیا اور آنکھوں کے ذریعے گلابی رخساروں کو بھگوتے ہوئے شبنم کے قطروں نے گنگا جمنا کا روپ لے لیا۔ سیلاب گزر گیا اور اُسے پُر سکون کر گیا۔ دل میں چھپی ہوئی ٹیس نے سر اُٹھا کر سرگوشی کی ''اگر تجھے اس روپ میں دھیرج دیکھتا تو پہنچان ہی نہ پاتا''۔ دوسرے ہی پل اُس نے ان خیالوں کو جھٹکا جس رشتے نے وجود میں آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا ہو، اُس کے بارے میں کیا سوچنا۔ وہ اٹھی کپڑے بدلے نیلی آسمانی چوڑیاں اتار کر رکھ دیں اور کام میں لگ گئی۔ جب تک پون گھر لوٹا وہ گھر کے سبھی کام نبٹا چکی تھی۔

گھر میں گھستے ہی پون نے میرا کا چہرہ پڑھنا چاہا تو پریشان ہوگیا۔ بیوی کے چہرے پر نہ کوئی گلہ نہ شکوہ نہ شکایت، نہ مایوسی نہ غصّہ۔ چہرہ پُر سکون جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اُس کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو شوہر کی اچھی خبر لیتی مگر وہ بالکل خاموش معمول کی طرح اس کے لیے پانی لے کر آئی اور آتے ہی پوچھا۔

''آج کام زیادہ تھا کیا؟''

''نہیں چھٹّی تو وقت پر ہی ہوگئی مگر راستے میں چند پرانے دوست مل گئے اور بس کافی ہاؤس میں جا بیٹھے۔ گپ شپ میں ایسے مست ہوئے کہ وقت کا پتا ہی نہ چلا''۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا اب تو یہ سُن کر وہ بھڑک اٹھے گی، غصّے میں لال پیلی ہو جائے گی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اُس کے چہرے کے تاثرات جیسے پرسکون تھے ویسے ہی رہے اور وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ میرا چاہ کر بھی شوہر سے کوئی گلہ نہ کر سکی۔

''کھانا لگادوں''

''تم نے کھالیا؟''

''ابھی نہیں''

''تو تم کھا لو۔ میں کھا کر آیا ہوں''۔ اُس نے اپنی طرف سے ایک اور نشتر چھوڑا مگر وہ ''اچھا'' کہہ کر وہاں سے چلی گئی اور پون پیر پٹکتا ہوا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی بھی اُس پر اپنا حق جمائے۔ اُس سے شکایت کرے، گلہ کرے، لڑائی کرے، جھگڑا کرے۔ وہ جان بوجھ کر اسے اُکساتا ایسی ایسی حرکتیں کرتا کہ اُسے غصہ آجائے اور جذبات کا ہر رنگ اُن کی زندگی میں گُھل جائے تاکہ رشتہ اور مضبوط ہو سکے مگر وہ نہ جانے کس مٹی کی بنی تھی کہ اس پر اگر اثر ہوتا بھی ہوگا تو بھی وہ ظاہر نہیں کرتی تھی بس خاموش رہتی اور پون اُس کے چہرے پر سپاٹ کو راپن دیکھ کر اُکتا جاتا، سٹپٹانے لگتا۔ جیسے کسی نے اس کی انا کو چوٹ پہنچائی ہو، وار کیا ہو، زخمی کر دیا ہو۔

شام پانچ بجے وہ سج سنور کر پون کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگی۔ اُس نے خاص پون کی پسند کی نیلے آسمانی رنگ کی سِلک کی ساڑھی پہنی تھی۔ حالانکہ اُسے ساڑھی اچھے سے باندھنی بھی نہیں آتی تھی پھر بھی اُس نے اپنی نند کی مدد سے اُسے سلیقے سے پہنا تھا۔ بال سنوار کر بنائے تھے۔ میک اپ کی اُسے ضرورت ہی نہیں تھی۔ نکھری ہوئی سفید رنگت، بھرے بھرے گلابی رخسار، لال گلاب کی پنکھڑی جیسے نازک ہونٹ، کالی بڑی بڑی آنکھیں اور اُس پر کاجل کی لکیر، ماتھے پر سجی گول بِندیا اور دونوں کلائیوں میں میچنگ نیلے آسمانی رنگ کی کانچ کی چوڑیاں۔

رما اپنی بھابھی کی خوبصورتی اور سادگی دیکھ کر دل ہی دل میں نہال ہو رہی تھی۔ کمی تھی تو بس ایک چیز کی۔ اس کے چہرے سے جذبات کے رنگ کبھی نظر نہیں آئے۔ چہرہ ہمیشہ سپاٹ ہوتا کورے کاغذ کی طرح۔ دو موٹی موٹی کالی دلکش آنکھیں بولتی نہ تھیں صرف اِدھر اُدھر سب نہارتی تھیں۔ کبھی کبھی ان آنکھوں میں خوف کی جھلک نظر آتی یا پھر شاید یہ احساسِ کمتری تھا۔

صبح کام پر جاتے وقت پون نے اُس سے کہا تھا ''شام کو تیار رہنا فلم دیکھنے چلیں گے''۔

اور وہ شام ہونے سے پہلے ہی گھر کے سب کام نبٹا کر تیار ہوگئی۔ انتظار کی گھڑیاں کاٹے سے نہیں کٹ رہی تھیں۔ کبھی وہ کمرے میں آکر ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتی تو کبھی ساس کے پاس جا بیٹھتی۔ شام کے سائے پھیل کر رات کے اندھیرے میں سمٹ گئے۔ آسمان پر چاند چمکنے لگا اور ستاروں کی محفل روشن ہوگئی مگر اس کا چاند نہ جانے کس بدلی میں چھپا تھا کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ فلم شروع کیا اب تو ختم ہونے کا وقت آ گیا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اُٹھ کر کپڑے بدل لے کہ ساس نے اپنے کمرے سے آواز لگائی:

''بہو اگر کھانا تیار ہو گیا ہو تو ہمارا کھانا لگادے''۔

''جی امّاں جی''۔

اتنا کہہ کر وہ اٹھی۔ آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔ اپنے عکس کو سراپا نہارا اور سوچنے لگی ''کتنی بدل گئی ہوں

میں۔ کیا فائدہ اتنا سجنے سنورنے کا جس کے لئے اتنا ہار سنگھار کیا اُسی نے ہی نہ دیکھا''۔

بے قرار دل میں اُمڈتے سیلاب کو اُس نے رہا کر دیا اور آنکھوں کے ذریعے گلابی رخساروں کو بھگوتے ہوئے شبنم کے قطروں نے گنگا جمنا کا روپ لے لیا۔ سیلاب گزر گیا اور اُسے پُر سکون کر گیا۔ دل میں چھپی ہوئی ٹیس نے سر اُٹھا کر سرگوشی کی ''اگر تجھے اس روپ میں دھیرج دیکھتا تو پہنچان ہی نہ پاتا''۔ دوسرے ہی پل اُس نے ان خیالوں کو جھٹکا جس رشتے نے وجود میں آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا ہو، اُس کے بارے میں کیا سوچنا۔ وہ اٹھی کپڑے بدلے نیلی آسمانی چوڑیاں اتار کر رکھ دیں اور کام میں لگ گئی۔ جب تک پون گھر لوٹا وہ گھر کے سبھی کام نبٹا چکی تھی۔

گھر میں گھستے ہی پون نے میرا کا چہرہ پڑھنا چاہا تو پریشان ہو گیا۔ بیوی کے چہرے پر نہ کوئی گلہ نہ شکوہ نہ شکایت، نہ مایوسی نہ غصّہ۔ چہرہ پُر سکون جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اُس کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو شوہر کی اچھی خبر لیتی مگر وہ بالکل خاموش معمول کی طرح اس کے لیے پانی لے کر آئی اور آتے ہی پوچھا۔

''آج کام زیادہ تھا کیا؟''

''نہیں چھٹّی تو وقت پر ہی ہوگئی مگر راستے میں چند پرانے دوست مل گئے اور بس کافی ہاؤس میں جا بیٹھے۔ گپ شپ میں ایسے مست ہوئے کہ وقت کا پتا ہی نہ چلا''۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا اب تو یہ سُن کر وہ بھڑک اٹھے گی، غصّے میں لال پیلی ہو جائے گی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اُس کے چہرے کے تاثرات جیسے پرسکون تھے ویسے ہی رہے اور وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ میرا چاہ کر بھی شوہر سے کوئی گلہ نہ کر سکی۔

''کھانا لگا دوں''

''تم نے کھا لیا؟''

''ابھی نہیں''

''تو تم کھا لو۔ میں کھا کر آیا ہوں''۔ اُس نے اپنی طرف سے ایک اور نشتر چھوڑا مگر وہ ''اچھا'' کہہ کر وہاں سے چلی گئی اور پون پیر پٹکتا ہوا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی بھی اُس پر اپنا حق جمائے۔ اُس سے شکایت کرے، گلہ کرے، لڑائی کرے، جھگڑا کرے۔ وہ جان بوجھ کر اسے اُکساتا ایسی ایسی حرکتیں کرتا کہ اُسے غصہ آ جائے اور جذبات کا ہر رنگ اُن کی زندگی میں گُھل جائے تا کہ رشتہ اور مضبوط ہو سکے مگر وہ نہ جانے کس مٹی کی بنی تھی کہ اس پر اگر اثر ہوتا بھی ہوگا تو بھی وہ ظاہر نہیں کرتی تھی بس خاموش رہتی اور پون اُس کے چہرے پر سپاٹ کو راپن دیکھ کر اُکتا جاتا، سٹپٹانے لگتا۔ جیسے کسی نے اس کی انا کو چوٹ پہنچائی ہو، وار کیا ہو، زخمی کر دیا ہو۔

چھ مہینے پہلے شادی کے بعد جب وہ چار روز کے لئے نینی تال گھومنے گئے تو پون نے ہچکچاتے ہوئے نئی نویلی دلہن سے پوچھا:

''اگر تم اجازت دو تو میں دو پیگ لگا لوں۔ موسم بھی سہانا ہے اور پھر تم بھی ساتھ ہو تو شام اور رنگین ہو جائے گی۔''

''اس میں اجازت کی کیا بات ہے۔ اگر آپ کا دل کر رہا ہے تو ضرور لے لو۔ میرے بابا تو روز شام کو پیتے تھے۔''

اس نے سوچا تھا کہ اُس کی بیوی اُسے جھٹ سے منع کر دے گی اور کہے گی:

''آپ شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں تو موسم کا مزہ مل کر لیتے ہیں کسی نشے کی کیا ضرورت ہے؟''

یہ پہلا موقع تھا جب اُسے حیرت ہوئی تھی۔ اُس نے بھی ضد میں پہلا دوسرا، تیسرا اور پھر چوتھا پیگ پی ڈالا۔ وہ اطمینان

سے اس کے پاس بیٹھی رہی نہ روکا نہ ٹوکا۔ اُس نے سگریٹ سلگائی اور دھواں اُس کے چہرے پر چھوڑ دیا وہ پھر بھی خاموش رہی۔ آرام سے بیٹھ کر اپنے گاؤں کی باتیں سناتی رہی اسے یہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ اُس کی باتیں پون سُن ہی نہیں رہا تھا وہ اکیلے ہی بولے جا رہی تھی۔

گھوم پھر کر جب وہ گھر لوٹے تو اُس نے ماں سے ملتے ہی اکیلے میں گلہ کر دیا۔

''میں نے اپنی زندگی کا ہر فیصلہ تم پر چھوڑا تھا ماں''۔

''میں نے کیا کوئی غلط فیصلہ کیا ہے؟'' ماں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس بار غلط ہے''۔

''کیا مطلب؟''

''آپ کی میرا ویسی نہیں جیسی مجھے چاہیے تھی''۔

''لڑکی خوبصورت ہے، سمجھدار ہے، بڑوں کی عزت کرتی ہے چھوٹوں سے پیار کرتی ہے۔ اور کیا چاہیے تجھے؟''

''سب ٹھیک ہے مگر مجھے جیتی جاگتی جذبات اور احساسات سے پُر عورت چاہیے کوئی موم کی گڑیا نہیں''۔

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور ماں اُس کی بات سمجھنے میں اُلجھ گئی۔

وہ ہمت نہیں ہارا۔ شاید نئی نویلی دلہن شرماتی ہوگی، گھبراتی ہوگی۔ شاید وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے۔ ہوسکتا ہے وہ ایک الگ ماحول سے آئی ہے اسی لئے ہر بات کا فرق ہے۔ اسے شہر کی لڑکیوں کی طرح، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا تھا۔ وہ ایک جنگلی پھول کی مانند تھی جو قدرت کے صاف شفاف ماحول اور حسین وادیوں میں پروان چڑھی اور اپنی مہک سے اپنے اردگرد کو متاثر کیا۔ اس پھول کو ایک گلدان میں لگا کر سجا دیا تو پھول کا کیا قصور۔ دھیرے دھیرے وہ پھول شہر کی آلودہ فضا میں مُرجھانے لگا اور اپنی مہک کھونے لگا۔

پون نے کئی پینترے آزمائے کہ وہ اُس کی کسوٹی پر کھری اُترے مگر ہر بار ناکام ہی رہا۔ سال بھر میں وہ جان گیا کہ اُس کی بیوی ایک خوبصورت گڑیا سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ چہرہ خوبصورت دل صاف مگر بے سلیقہ۔ وہ اسے اپنے ساتھ دعوتوں، محفلوں ہوٹلوں میں لے جانے سے کترانے لگا اور میرا نے بھی گھر کی چار دیواری قبول کر لی۔ ساس اور نند کی جی توڑ محنت کا اثر اتنا ہوا کہ بظاہر تو اس میں تبدیلی آ گئی ڈھنگ کے کپڑے پہننے کا سلیقہ آ گیا مگر شہر کی ماڈرن لڑکیوں کے طور طریقے نہ سیکھ سکی۔ گھر گرہستی کا سارا بوجھ اس نے اپنے ذمہ لے لیا۔ گھر کے ہر فرد کی ضرورتوں کا خیال رکھتی۔ ساس کو زمین پر پیر نہیں رکھنے دیتی تھی۔ کبھی اُس نے زبان نہیں چلائی، ماتھے پر کسی نے شکن نہیں دیکھی پھر اسی بہو سے کوئی خوش نہ ہوتا مگر جب بھی ماں بہو کی تعریف کرتی تو وہ جل کر رہ جاتا اور کڑواہٹ بھرے لہجے میں کچھ نہ کچھ تو کہہ ڈالتا:

''آپ کو اچھی بہو ملی آپ خوش رہو۔ مجھے تو بیوی چاہیے تھی خادمہ نہیں۔ نصیب اپنا اپنا''۔

بیٹے کی باتوں میں چھپی مایوسی اور طنز ماں کو بے چین اور پریشاں کر دیتا۔ کچھ لوگ وقت اور ماحول کے ساتھ خود بخود بدل جاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو لاکھ کوششوں کے باوجود ویسے کے ویسے ہی رہتے ہیں۔ میرا بھی اُن میں سے ایک تھی۔ گھر پر سب کو خوش رکھنے کے فراق میں اُس نے اپنی ہستی کو ہی بھُلا دیا۔ جس شوہر کو دن کے اجالے میں اس میں سینکڑوں عیب نظر آتے تھے وہی رات کی تنہائی میں سب دُوریاں مٹا کر اپنی پیاس بجھانے اُسی کنویں پر جاتا۔ مگر کنویں نے کبھی حقارت کا جواب نفرت سے نہیں دیا۔ پیاس مٹتے ہی اُسے چھپے ہوئے عیب پھر نظر آنے لگتے۔

سب کی نظروں میں وہ بے چاری بن کر رہ گئی۔ شوہر کی اتنی خدمت کے باوجود اُس کی محبت حاصل نہ ہوسکی۔

بے چاری کا خطاب اُسے شادی کے بعد ملا تھا۔ ماں تو اُسے پیار سے نصیبو کہا کرتی تھی۔ پہاڑوں میں پیچھے ایک چھوٹے سے گاؤں چوپال میں اس کا جنم ہوا۔ باپ کے سیب اور چیری کے باغ تھے۔ میرا کے پیدا ہوتے ہی ایک عرصے سے لٹکا زمین کا جھگڑا سلجھ گیا اور کھوئی ہوئی زمین حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہوگیا۔ وہ اُسے پیار سے لکشمی بھی کہتا تھا اُس کا ماننا تھا کہ بیٹی کے قدم پڑتے ہی گھر میں خوشحالی آ گئی۔ پھر جب اس کے بعد ایک کے بعد ایک دو لڑکوں نے جنم لیا تو ماں نے اُسے نصیب والی کا خطاب دے دیا۔ جب اُسے بیٹی پر زیادہ لاڈ آتا تو اُسے ''نصیبو'' کہہ کر پکارتی۔ جس سال سیب اور چیری کی فصل اچھی ہوتی گھر میں لہر بہر ہو جاتی اور جس سال موسم کا یا قدرت کا قہر برپا ہوتا، ماں گھر گرہستی کا خرچ سوچ سمجھ کر بڑے سلیقے سے کرتی۔ اُس کی کوشش ہوتی کہ کہیں بھی بچوں کو کسی چیز کی کمی نہ ہو پھر بھی تنگ دستی کی حالت خود بخود عیاں ہو جاتی۔ باپ کے چہرے کی رونق اُن کے جاندار قہقہے، ان کی بھری جیب کا اعلان کر دیتے اور اگر شام ڈھلے وہ شراب کے نشے میں چُور لڑکھڑاتے قدموں سے گھر میں قدم رکھتے اور ماں کے کوسنے شروع ہو جاتے تو اسے خبر ہو جاتی کہ باپ کی جیب خالی ہے۔ ماں کو اُن کے شراب پینے پر اعتراض نہیں تھا یہ تو گاؤں کے مردوں کا ایک اہم شغل تھا۔ شام ڈھلے کبھی تپکھی سردی سے بچنے کو کبھی میٹھی سردی کا مزہ لینے کے لئے اس کا سہارا لیتے۔ ماں کہتی شراب پینی ہے تو حساب کی پیؤ اور گھر بیٹھ کر پیؤ تا کہ رات کے اندھیرے میں سڑکوں اور کھائی میں گرنے اور آوارہ کتوں سے منہ چٹوانے سے تو بہتر ہے۔ ماں لڑتی جھگڑتی رہی مگر اُس کا باپ اپنی من مانی کرتا رہا۔

پون نے یہ عادت بنالی تھی کہ دفتر سے وہ دوستوں کے ساتھ گھوم پھر کر رات کو ہی لوٹتا اور اکثر شراب کے نشے میں چُور۔ شادی سے پہلے تو وہ صرف خاص موقعے پر ہی شراب کو ہاتھ لگاتا تھا۔ شادی کے بعد دھیرے دھیرے یہ اُس کی عادت بن گئی۔ بیوہ ماں نے اُسے جب بھی سمجھانا چاہا تو بیٹے نے ماں کے سر ہی الزام دھر مارا۔ اُس نے کون سا اپنے بیٹے یا اپنے خاندان کا بُرا چاہا تھا وہ تو اپنے کسی رشتے دار کی شادی میں شامل ہونے گئی تو اُس کی نظر اس تازہ کھلی کلی پر ٹھہر گئی جو بھیڑ میں سب سے الگ لگ رہی تھی۔ اُس لڑکی کی سادگی، اس کا ٹھہراؤ اُس کی خوبصورتی اُسے پسند آئی۔ وہ جتنے دن وہاں رہی اُس کی نظر میں اُس لڑکی کو تولتی اور ٹٹولتی رہی۔ پھر اُس نے اُس ہیرے کو اپنی تجوری میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ بیٹے نے سب فیصلہ ماں پر چھوڑ دیا تھا اور جب اُس نے میرا کے ماں باپ سے اُس کا ہاتھ مانگا تو وہ چونک اُٹھے۔ باپ اتنی دُور بیٹی بیاہنا نہیں چاہتا تھا۔ ماں کو ڈر تھا کہ بیٹی شہر کے طور طریقے اور بڑے گھروں کے رہن سہن سے ناواقف ہے۔ جب اُس نے اپنے دل میں اٹھنے والے اندیشے ظاہر کئے تو پون کی ماں نے بات ہنس کے ٹال دی۔

''یہ کون سی بڑی بات ہے۔ لڑکی پڑھی لکھی ہے خود کو بدل لے گی۔ ہم کون سا اس شہر میں پیدا ہوئے ہیں۔ میں بھی تو چھوٹی جگہ سے آئی ہوں مگر حالات کے ساتھ خود کو بدلا ہے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ یہ سب آپ بے فکر ہو کر مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ کی بیٹی راج کرے گی راج''۔

کسی نے میرا سے اُس کی مرضی نہیں پوچھی اور چار دنوں میں وہ شادی کے بندھن میں بندھ گئی۔ اب بے چاری کیسے بتائے ماں باپ کو کہ وہ گھر کی رانی تو ہے گھر کا ہر کام اُس کی مرضی سے ہوتا ہے مگر اس کا راجا اُس سے دور دور رہتا ہے۔ صرف قریب اپنی ضرورت پوری کرنے ہی آتا ہے۔

جب میرا بہو، بیوی سے ماں بنی تو اُس کے دل میں ایک اُمید نے جنم لیا کہ شاید یہ کڑی اُن دونوں کے بیچ کی دُوریاں مٹا دے۔ رشتے تو مضبوط نہ ہو سکے پر اتنا ضرور ہوا کہ پون کو یہ بندھن توڑنے کا ارادہ ترک کر دینا پڑا۔ اس نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور اس رشتے کو اپنی لاڈلی کی خاطر قبول کر لیا۔ میرا نے بچی کو جنم دینے کا سکھ تو حاصل کر لیا پر بیٹی کے نام سے لے کر اُس کی پرورش کے ہر اہم فیصلے پر اُس کا کوئی حق نہ تھا۔ پون نے اُس کا نام نینا رکھا اور اُس نے یہ طے کر لیا کہ اب وہ اپنا سارا وقت نینا کو ہی دیگا۔ ہر بچہ گھر سے اور خاص طور سے اپنی ماں سے زندگی کے طور طریقے سیکھتا ہے۔ کہیں بیٹی بھی ماں جیسی ہی نہ بن جائے، اس ڈر سے اُس نے یہ فیصلہ کیا۔ زمانے کے طور طریقے سکھانے کے لئے اُس نے شہر کے سب سے اچھے سکول میں نینا کا داخلہ کروایا۔ اُس وقت اُسے یہ احساس نہیں ہوا کہ ماں بیٹی کے بیچ فاصلہ بڑھ جائے گا۔ جس گھر میں عورت کی عزت اُس کا مرد نہیں کرتا وہاں اس کی عزت اُس کی اولاد بھی نہیں کرتی۔ نینا نے جب ہوش سنبھالا تو اُسے اپنی دوستوں کی پڑھی لکھی ماڈرن ماؤں سے مل کر بہت مایوسی ہوئی۔ مایوسی سے زیادہ کمتری کا احساس اتنا بڑھ گیا کہ اُسے اپنی سہیلیوں کو اپنے گھر بلانے میں شرم محسوس ہونے لگی۔ ماں اگر کبھی اُسے کسی بات پر ڈانٹ دیتی تو باپ بیٹی کے سامنے ہی میرا کو ڈپٹ دیتا۔ اور اگر وہ خود نہ ڈانٹ کر پون کو بیٹی کی گستاخیوں سے آگاہ کرانا چاہتی تو اُسے الٹے چار باتیں سُننا پڑتیں۔ اُن دونوں کے لیے اس کا وجود صرف اس قدر محدود تھا کہ وہ ان کے ہر کام آرام سے کر کے دیتی تھی۔

ساس کے گزر جانے اور نند کی شادی کے بعد وہ اپنے ہی گھر میں بالکل تنہا ہوگئی۔

اتنے سالوں میں وہ صرف دو بار ہی میکے گئی ایک شادی کے بعد اور دوسرے جب نینا چار سال کی تھی۔ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ سوچتی میکے جائے گی مگر نینا جانے کو تیار ہی نہ ہوتی۔

''اتنی بور جگہ ہے مجھے اپنی چھٹیاں خراب نہیں کرنی۔ آپ اکیلے چلے جاؤ میں پاپا کے پاس رہ لوں گی''۔

بچی کو اکیلے چھوڑ کر وہ کیسے جاتی۔ دھیرے دھیرے میکے والوں سے صرف فون ہی رابطے کا ذریعہ رہ گیا۔

گھر کی چار دیواری اور اُس کے اندر پھیلتا سُناپن اُسے دیمک کی طرح چاٹنے لگا اور وہ ڈپریشن کا شکار ہوتی چلی گئی۔ ایک روز وہ اس قدر ٹوٹی کہ بستر ہی پکڑ لیا۔ شادی کے سولہ سال وہ اپنے شوہر اور اس گھر کی خدمت میں اتنی مصروف رہی کہ اُس نے انہیں ہی اپنی دنیا بنا لیا اور آج جب وہ خود بستر پر لگ گئی تو باپ بیٹی کے ہاتھ پیر پھولنے لگے۔ ان دونوں نے تو کبھی خود کے لئے بھی پانی کا گلاس نہ اُٹھایا تھا تو وہ اس کی تیمارداری کیسے کرتے مجبوراً اُس کے میکے والوں کو فون کیا گیا اور وہ سنتے ہی بیٹی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ڈاکٹروں کا بھی مشورہ تھا کہ آب و ہوا کا بدلاؤ اُس کے لیے ضروری ہے پھر چوپال سے بہتر کون سی جگہ ہو سکتی تھی۔

ایک مدّت بعد وہ اپنے گھر لوٹی تھی۔ وہی اونچے اونچے پہاڑ، وہی چیل اور دیودار کے درخت، وہی دوپہر کی میٹھی میٹھی دھوپ، وہی شام کی چلچلاتی ٹھنڈی ہوا، وہی تازہ فضا وہی کھلا آسمان اور وہی سیدھے سادے لوگ۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا مگر وہ اس زمین سے کیا بچھڑی، وہ تو خود سے بھی جدا ہوگئی۔ پُرانے سنگھی ساتھی کچھ تو وہی تھے اور باقی اس کی طرح بہترین زندگی کی خواہش میں اپنی جڑوں سے بہت دُور نکل گئے تھے۔ اس نے کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا پھر اُسے کون یاد رکھتا۔ ایک ساتھی باقی بچی تھی۔ وہ جب بھی آتی ماضی کے جھرنکوں کی کھڑکی کا پٹ دھڑ سے کھول دیتی۔

بچپن اور جوانی کی کھٹی میٹھی باتیں تنہائی میں چپکے سے

آ کر اُسے اُداس کر جاتی تھیں، جس نے قسم کھائی تھی کہ میرا کے کبھی روبرو نہ ہوگا اگر اتفاقاً کہیں مل بھی جائے تو اجنبی بن کر راستہ بدل لے گا، وہ بھی اس کی بیماری کی خبر سُن کر سب گلے شکوے بھول کر اُس سے ملنے چلا آیا۔ دھیرج وہی سرکاری سکول میں پڑھاتا تھا۔ بچپن سے ہی میرا کو چاہتا تھا دونوں نے ایک ساتھ کھیل کُود کر لڑ جھگڑ کر ہنستے روتے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ اس نے کبھی اپنے جذبات کو لفظوں میں ظاہر کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی اور میرا ان کہی خواہشوں کو سمجھ نہ سکی۔ میرا کی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ نے اُسے توڑ دیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی اُن کا ساتھ چھوٹ جائے گا۔ دل کی دل میں ہی دب کر رہ گئی۔ سب سے اپنا پیار چھپا کر وہ زندگی میں بڑھتا گیا۔ ماں باپ کی لاکھ کوششوں کے باوجود ان کی شادی کی تجویز ٹالتا رہا۔ بڑی پُرسکون زندگی بسر کر رہا تھا کہ میرا کی آمد اور اُس کی ناسازطبیعت نے ایک بار پھر سوئے ہوئے خوابوں کی ٹیس سے آشنا کر دیا۔ وہ یہ سوچ کر گیا تھا کہ اُسے دیکھ کر اُس سے مل کر وہ کِھل اُٹھے گی، خوشی سے اُچھل پڑے گی۔ پھر وہ دونوں مل کر گزرے دنوں کی باتیں یاد کر کے بچپن میں لوٹ جائیں گے۔ مگر اُسے دیکھ کر مل کر اُسے بڑی مایوسی ہوئی۔ میرا کے زرد چہرے پر نہ ہی مسکراہٹ آئی اور نہ ہی ویران اداس آنکھوں میں خوشی کی چمک نظر آئی۔ اُس کے روم روم سے یاس، نا اُمیدی، ٹیس، ٹوٹے خوابوں کی کسک اور زخمی ہوئے جذبات چھپائے سے بھی نہیں چھپ رہے تھے۔ رسمی گفتگوں کے بعد وہ جلد ہی دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے بوجھل من سے وہاں سے چلا آیا۔ اس کی حالت دیکھ کر خود کو کوستا رہا کہ وہ اتنے سال دل میں رنجش کیوں پال کر بیٹھا تھا۔ وہ بے چاری تو خود سے لڑائی لڑتے بکھر گئی تھی، ٹوٹ گئی تھی۔

دھیرج کا بس چلتا تو میرا کے پاس سے ہی نہ اُٹھتا مگر لوک لاج کے مارے دوسرے تیسرے دن میرا کو ملنے آ جاتا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ اُسے باتوں میں ایسے بہلائے کہ وہ اپنے دل پر پڑے غبّار کو اُتار پھینکے۔ ماں باپ، دونوں بھائی اُس کے آگے پیچھے گھومتے مگر اکیلے پن کا احساس اُس کے اندر سے کم نہیں ہو رہا تھا۔ سب کے ہوتے وہ خود کو تنہا سمجھتی۔ دھیرج کو اپنے لئے پریشان دیکھتی تو ان دیکھے خواب چپکے سے اُس کی آنکھوں میں لوٹ آتے اور بیتے دنوں کو ڈھونڈنے لگتے۔ دل ہی دل میں اُسے یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ جن کے لئے خود کو بھلا دیا وہ میرے اپنے ہیں اور وہ ہی اپنے اُسے بھلائے بیٹھے ہیں۔ اُن کے لئے وہ رات رات بھر جاگی تھی۔ ہمیشہ ان کی سلامتی کی دُعائیں مانگتی اُنھیں دیکھ کر وہ جیتی رہی اور اُنہیں اپنوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تیمارداری تو دُور کبھی خبر تک نہ لی۔ اُس کا حال جاننے کی زحمت تک نہ کی۔ ہر صبح وہ ایک آس لئے اُٹھتی کہ شاید آج فون آ جائے۔ شاید بیٹی کو اُس کی یاد آ جائے یا شاید پون بھولے سے اُسے یاد کر لے اور دن ڈھلتے ہی مایوسی کا اندھیرا اور گہرا ہو جاتا اور دھیرے دھیرے وہ ان اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی۔ زبان نے چُپ اختیار کر لی اور لبوں سے ہنسی چُرا لی۔ مسکراہٹ نہ جانے کن خلاؤں میں گُم ہوگئی اور کڑواہٹ نے وجود کو جلانا شروع کر دیا۔ بھوک ختم ہوگئی تو جسم بے جان تھکا تھکا نڈھال سا رہنے لگا۔ اپنوں کے بے رخی، بے قدری، بے نیازی کا گُھن لگ گیا جو اُسے اندر ہی اندر دن بہ دن کھوکھلا کئے جا رہا تھا۔ ڈاکٹروں کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی اُن کا کہنا تھا کہ:

''ہم علاج کر سکتے ہیں مگر مریض کے اندر جینے کی خواہش کو زندہ نہیں کر سکتے۔ یہ سب تو آپ لوگ ہی کر سکتے ہیں''۔

بیٹی کی بگڑتی حالت دیکھ کر ماں باپ کا کلیجہ منہ کو آ جاتا۔ بیٹی سے چھپ چھپ کر آنسو بہاتے اور کوشش کرتے کہ

اُس کے اردگرد کا ماحول خوشگوار ہو۔ پون کو اُس کی گرتی حالت سے آگاہ کرنا چاہا تو میرا نے اپنی قسم دے کر منع کر دیا:

''بابا میں دیکھنا چاہتی ہوں کب تک اُن کو میری یاد نہیں آتی۔ یاد نہ بھی آئے کیا میری کبھی ضرورت بھی نہ پڑے گی؟''

''بیٹی یہ آزمائش چھوڑ دے۔ کبھی کبھی ان آزمائشوں میں رشتے کھو جاتے ہیں''۔

''بچا ہی کیا ہے بابا۔ دیکھنا چاہتی ہوں میں نے اتنے سالوں میں کیا کمایا''۔

''یہ ضد چھوڑ دے بیٹی۔ اپنی قسم واپس لے لے''۔

''یہ ضد نہیں ہے بابا۔ ایک چھوٹی سی خواہش ہے۔ بس اور کچھ بھی نہیں''۔

انھیں مجبوراً اُس کی خواہش کا احترام کرنا پڑا۔

ادھر کچھ دن تو پون خوشی خوشی گھر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری نبھاتا رہا۔ صبح سے شام تک گھر سنبھالنے والی، کھانا پکانے والی آرام سے مل گئی اور خود وہ آزاد پرندے کی طرح بے فکر ہو گیا۔ گھر پر موجود جوان ہوتی بیٹی کو بھی جب آزادی راس آنے لگی تو اُسے یہ آزادی کھٹکنے لگی۔ نوکرانی کے ہاتھ کے بنے کھانے میں وہ ذائقہ نہ تھا جو میرا کے کھانے میں ملتا تھا۔ بیٹی کی ذمہ داری کا بوجھ بڑھنے لگا تو اُسے میرا کی غیر موجودگی کھلنے لگی۔ میرا کے ہوتے ہوئے کسی چیز کی فکر نہ تھی۔ اُس کی زندگی کی ہر فکر ہر ذمہ داری ہر غم میرا نے اپنے سر لے رکھے تھے۔ پھر بھی کبھی اُس نے اُف تک نہ کی۔ نہ کبھی اس نے روکھے برتاؤ کا شکوہ کیا نہ محرومیوں کا کوئی گلہ کیا، نہ کبھی کوئی فرمائش کی نہ کسی بات کی شکایت۔ وہ سوچتا تھا روٹی کپڑا دے کر وہ اس کی سبھی ضرورتیں پوری کر دیتا ہے۔

اب اُسے احساس ہوا کہ وہ بھی کچھ خواہشیں، کچھ ارمان کچھ تمنائیں، آرزوئیں کچھ خواب لے کر اس گھر میں آئی ہوگی۔ اُس نے بھی اپنے جیون ساتھی کو لے کر کچھ سپنے سجائے ہونگے۔ وہ بھی تو ریزہ ریزہ بکھر گئے ہونگے۔ وہ پھر بھی اس کی ضرورتوں کو پورا کرتی رہی چاہے وہ ذاتی ہو، گھریلو ہوں یا پھر جسمانی۔ وہ تو صرف اپنے ٹوٹے ارمانوں کو لے کر روتا رہا۔ اپنے سے باہر ہی نہیں نکلا اور نہ میرا کی قربانی، اُس کا پیار، اس کی سچائی کو سمجھ سکا۔ اس نے تو ماں بیٹی کے رشتے کو بھی پنپنے نہیں دیا۔ نہ خود اس کی عزت کی اور نہ ہی بیٹی کو ماں کے وجود کو نظر انداز کرنے کے لئے ڈانٹا بلکہ وہ اسے ہوا دیتا رہا۔ اپنی ہی نظروں میں وہ مجرم بن گیا اور جیسے جیسے احساسِ گناہ بڑھتا گیا میرا سے ملنے کی تڑپ بھی بڑھتی گئی۔ ان تین مہینوں میں اس نے ایک بار بھی اپنی بیوی سے بات نہیں کی تھی بس رسماً گھر والوں سے ایک دو مرتبہ حال دریافت کر لیا۔ اب وہ اس کے پاس جائے تو کس منہ سے جائے۔ اُداسی کے بادل بڑھنے لگے تو دل میں مایوسی چھانے لگی۔ مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا۔ دل تو چاہتا تھا کہ اس کیفیت سے نجات پا لے مگر انا بیچ میں آ جاتی۔ راستہ سامنے تھا منزل دکھائی دے رہی تھی پر قدم اس قدر بوجھل ہو گئے کہ اُٹھائے سے بھی نہیں اُٹھ رہے تھے۔ نینا کو لے کر بھی وہ پریشان تھا۔ اب اسے لگتا تھا کہ اس نے بیٹی کو کچھ زیادہ ہی آزادی دے رکھی ہے یہ عمر تو ناسمجھ ہے اس عمر میں اکثر پیر لڑکھڑا جاتے ہیں۔ آج تک وہ میرا کی باتیں ان سنی کرتا رہا مگر اب وقت آ گیا ہے کہ وہ تھوڑی سختی برتے اور اسے زندگی کی اونچ نیچ سے آگاہ کرے۔ یہ کام تو ماں کا ہے اور ماں کے ہوتے ہوئے بھی یہ فرض باپ کو نبھانا پڑے کتنے افسوس کی بات ہے۔ ایسی ہی الجھنوں میں وہ مبتلا رہنے لگا۔ اُس کی یہ کیفیت دیکھ کر یار دوستوں کے لئے وہ رحم کا مرکز بن گیا۔ دفتر کے فرائض بھی وہ اچھے سے نہیں نبھا پا رہا تھا۔ ایک روز طبیعت کچھ ناسازی محسوس ہوئی تو وہ جلدی چھٹی کر کے گھر

آ گیا۔ گاڑی ابھی پارک ہی کی تھی کہ کانوں میں زور زور سے music کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں اُسی کے گھر سے آ رہی تھیں۔اس نے قدم اندر رکھا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نینا اپنے چند دوستوں کے ساتھ جن میں لڑکیاں بھی تھیں اور لڑکے بھی رقص کرنے میں اتنے مشغول تھے کہ اُنھیں اپنے بکھرتے جسموں کا بھی ہوش نہ تھا۔ اُنھیں اُس کی آمد کا احساس بھی نہ ہوا۔ وہ خاموش کھڑا پہلے دیکھتا رہا پھر غصّے سے بڑھ کر music بند کر دیا۔ سب کے تھرکتے جسم یکدم رُک گئے۔ نینا نے دیکھا اور لپک کر اُس کی طرف بڑھی۔

''پاپا آپ جلدی آ گئے؟ آیئے میں آپ کو اپنے دوستوں سے ملواتی ہوں''

اُن کے چہرے کے تاثرات اور غصّے کو نظر انداز کیے وہ اُن سب سے ملانے لگی۔

''نینا تم سب کو دروازے تک چھوڑ کر ابھی اسی وقت میرے کمرے میں آؤ ضروری کام ہے۔''

''مگر پاپا۔۔۔''

بِنا کچھ کہنے سُنے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس سے پہلے نینا نے اپنے پاپا کو اس طرح پریشان اور غصّے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی جلد ہی سب کو رخصت کر کے اس کے پاس چلی آئی۔

''تم اپنا بیگ پیک کر لو کل صبح ہم نکل رہے ہیں''

''کہاں کے لئے؟''

''چوپال تمہاری ماں کو لینے جانا ہے۔ ابھی وقت زیادہ ہو چکا ہے سفر لمبا ہے اس لئے صبح سویرے ہی نکلنا ہے''۔

اس سے زیادہ کچھ پوچھنے کی اس کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

پشیمانی کے باعث اُسے کسی پہلو چین و قرار نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ صبح کے انتظار میں وہ کروٹیں بدلتا رہا اور ماضی کے اوراق آنکھوں میں پلٹتے رہے۔ نہ جانے رات کے کس پہر آنکھ لگی تھی کہ دروازے پر زور زور کی دستک سے وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ دروازہ کھولا تو سامنے میرا کھڑی تھی۔

''تم اس وقت؟ ساتھ کون آیا ہے؟'' اس نے باہر جھانک کر دیکھا تو سڑک بالکل ویران سُنسان تھی۔ سردی کی وجہ سے باہر دُھند بھی چھائی ہوئی تھی اور گلی کے کُتّے بھی کہیں دُبکے ہوئے تھے۔

''آپ تو بھول ہی گئے مجھے؟'' گلہ کرتے ہوئے وہ گھر میں داخل ہو گئی۔

''تمہاری طبیعت تو ابھی بھی ٹھیک نہیں لگ رہی''۔ اس نے میرا کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ ابھی بھی زرد ہے۔ آنکھیں تھکی تھکی اُداس۔

''تم آئی کیسے ہو۔ ساتھ کوئی نہیں آیا؟'' اُس نے پھر حیرت سے پوچھا۔

''کمال کرتے ہو اپنے گھر آئی ہوں۔ کسی کے ساتھ کی کیا ضرورت۔'' وہ آرام سے صوفے پر بیٹھ گئی اور پون بھی اس کے پہلو میں جا بیٹھا۔ اُس کا ہاتھ ہاتھوں میں تھام لیا۔

''کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں''۔ وہ اُس کے ہاتھ رگڑ کر گرمی پہنچانے کی کوشش کرنے لگا۔

''رہنے دو ٹھیک ہو جائیں گے۔ کیسے ہو آپ؟''

''سوچا نہ تھا کہ تمہارے بنا زندگی عذاب بن جائے گی اچھا کیا جو تم لوٹ آئیں۔ اب اپنا گھر سنبھالو''۔

''تم نے تو کبھی بھولے سے بھی یاد نہ کیا''۔ پہلی بار اُس نے گلہ کیا۔

''میری شرمندگی مجھے تمہارے پاس آنے سے روکتی

رہی۔یقین مانو کل صبح ہی چلنے والے تھے تمہیں لینے۔دیکھو سامان تیار پڑا ہے''۔اس نے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ دھیرے سے مسکرادی۔

''نینا کیسی ہے؟ سو رہی ہے کیا؟''

''بہت ضرورت ہے اُسے تمہاری۔نادان ہے۔اب تم آ گئی ہو تو مجھے فکر کوئی نہیں''۔

''بہت تھک گئی ہوں۔نینا کے پاس جا کر آرام کرنا چاہتی ہوں''۔یہ کہہ کر وہ اُٹھی اور نینا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''نینا کو اٹھالو''۔

''نہیں نہیں سونے دو اُسے۔میں بھی اس کے ساتھ سو جاتی ہوں''۔وہ بھی اُس کے ساتھ نینا کے کمرے میں آ گیا۔نینا آرام سے سو رہی تھی۔میرا نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔جُھک کر اُس کا ماتھا چوما اور اس کے ساتھ اُس کی رضائی میں ہی گھُس گئی۔

پون نے ''گڈ نائیٹ'' کہتے ہوئے بتی بجھا دی۔اور اپنے کمرے کی طرف طرف چلا گیا۔

بستر پر لیٹ کر اُس نے چین کی سانس لی۔

میرا کے لوٹ آنے سے دل پر پڑے بوجھ سے راحت ملی تھی۔

ابھی نیند کا جھونکا آیا بھی نہ تھا کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

اُس نے بتی جلا کر دیکھا رات کے تین بج رہے تھے۔

''ہیلو''

''پون بیٹا میں بابا بول رہا ہوں''۔

''کیسے ہیں آپ؟''

''اگر ہو سکے تو صبح یہاں چلے آؤ۔اس بدنصیب کو کاندھا دینے''۔ڈوبی ہوئی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔

''کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟''

''آدھا گھنٹا پہلے وہ ہم سب کو چھوڑ گئی۔بہت انتظار کیا اُس نے تمہارا''۔

یہ سنتے ہی فون اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور چہرہ پسینے سے شرابور ہو گیا۔وہ نینا کے کمرے کی طرف لپکا۔نینا اکیلی بستر پر معصوم بچے کی طرح نیند میں مسکرا رہی تھی جیسے ابھی ابھی ماں نے پیار سے سہلا کر لوری دے کر سلایا ہو۔

چادر کی سلوٹیں بتا رہی تھی کہ ابھی ابھی کوئی وہاں سے اٹھا ہے۔

OOO

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین

کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب

سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:

زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۶

ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔۸۲

اسداللہ شریف

افسانہ

گتھّی

پوجاوشال کے لئے ایک معمّہ بن کر رہ گئی تھی۔ایک ایسی پہیلی جسے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔پوجا کا عجیب سا رویّہ .....روکھا انداز.....نرالی باتیں اکثر وشال کو ناگوار لگتیں.....لیکن وہ اس پیاری سی ،موہنی صورت والی لڑکی سے ملے بغیر بھی نہ رہ سکتا تھا۔ پوجا کی دوستی اُس کے لئے ایک نشہ بن گئی تھی۔پوجا تھی بھی ایسی .....خوش رُو،خوش رنگ....سانچہ میں ڈھلا کومل سا بدن۔مانو نسوانیت کی کوئی مورت ہے۔پر نہ جانے کیوں پوجا کو اپنی نسوانیت سے ہی چڑ تھی۔اپنے عورت ہونے کا دکھ تھا۔جیسے بنانے والے نے اُسے عورت بنا کر اُس پر ظلم کیا ہو۔وہ بار ہا اُسکے روبرو یہ جملہ دہرا چکی تھی۔''کاش مَیں عورت نہ ہو کر مرد ہوتی۔''

وشال بس اُسے ایک ٹک دیکھ کر رہ جاتا۔وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ کیسی عورت ہے جو مرد بننا چاہتی ہے۔جبکہ مرد اُسکی کوکھ سے ہی جنم لیتا ہے۔آخر وہ عورت کی عظمت کو کیوں نکارنا چاہتی ہے جبکہ عورت تو وہ دھرتی ہے جسکے سوتوں سے محبت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔جسکے دھنک رنگوں سے کائنات میں رنگ بھرتے ہیں۔جو روپ بدل بدل کر انسانیت کی سیوا میں لگی رہتی ہے۔آخر ایک عورت کو اپنے عورت پن سے نفرت کیوں؟؟

ایک شام آفس کے کینٹین (Canteen) میں چائے پیتے سمے وشال نے اُس سے پوچھ ہی لیا۔''پوجا تمہیں عورت ہونے سے اتنی نفرت کیوں ہے؟''سوال بجلی کی طرح اُس پر گرا تھا۔اُس کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور آنکھیں سکڑ کر چھوٹی ہو گئیں۔جیسے وشال نے کئی ٹن وزنی سوال اُسکے ذہن پر لاد دیا ہو۔کچھ پل یونہی گزر گئے۔پھر وہ ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔''کسی دن بتاؤں گی۔''پھر وہ ایک جھٹکے سے اُٹھی اور کچھ بتائے بغیر چلدی۔کینٹین کے باہر کھڑی اپنی اسکوٹر اسٹارٹ کی اور فرّاٹے بھرتی ہوئی چلی گئی۔

پوجا کی ایسی ہی باتیں وشال کو بُری طرح کھٹکتی تھیں.....اُس کا اکھڑا اکھڑا پن.....روکھا روکھا انداز.....کبھی کبھی بے مرّوتی سے پیش آنا۔آفس میں کتنے لڑکے تھے جو اُس کی ایک نظر کے لئے تڑپتے.....کتنی لڑکیاں اُس سے قریب تر ہونا چاہتیں،اُس سے دوستی کرنا چاہتیں..... پر وہ کسی کو لِفٹ ہی نہیں دیتی تھی۔یہاں تک کے لوگ اُسے گھمنڈی سمجھنے لگے تھے پر اُسے اس کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ان سب باتوں کو لے کر وشال کو لگتا تھا کہ پوجا کی شخصیت میں کوئی ایک گانٹھ ہے...ذہن میں کہیں ایک گرہ لگی ہوئی ہے جس کا کوئی سرا نظر نہیں آ رہا۔وشال تو چاہتا تھا کہ وہ پوجا کے خیالات کا تعاقب کرتے ہوئے اُسکے ذہن تک رسائی حاصل کرے۔اُس کے باطن میں جھانک کر دیکھے۔پر پوجا تو ایک ایسی بند مٹّھی تھی جو زور لگانے پر کھل نہ پاتی۔اُس نے اپنے اطراف ایک فولادی خول بنا لیا تھا۔ایک ایسی فصیل جسے کوئی پار نہ کر سکے۔

دوسرے دن پوجا آفس آئی تو سب کی نظریں اُسکا طواف کرنے لگیں۔وشال نے بھی اُسے ایک ٹک دیکھا اور اپنی نظریں نیچی جھکا لیں۔وہ ایکدم سے ویسٹرن کپڑے زیب تن کئے ہوئے تھی.....چست جینز جو گھٹنوں تک چڑھی ہوئی تھی....بدن سے چمٹا ہوا سلیولیس ٹی شرٹ۔کپڑے جہاں اُسکے حسن کو دو آتشہ کئے ہوئے تھے وہیں اُسکے جوبن کے اُتار چڑھاؤ کو بھی نمایاں کر رہے تھے۔لڑکیوں نے اُسے نگاہ بھر دیکھا اور پھر نگاہوں ہی نگاہوں میں اُس اجنتا کی مورت کو سلامی دیتے ہوئے اپنے اپنے کام میں جُٹ گئیں۔لڑکوں کی بات ہی اور تھی.....اُن کے تو سِٹّی ہی گم ہو گئی

تھی۔ایک دو نے تو ہولے سروں میں سیٹی بھی بجائی تھی۔ وہ اپنی ہوس زدہ نگاہیں لئے کھا جانے والی نظروں سے زاویے بدل بدل کر پوجا کو گھورے جا رہے تھے۔وشال کو اپنے ہی محلّہ کی قضاب کی دکان کا منظر یاد آ گیا۔ جہاں گلّی کے آوارہ کتّے اکھٹے ہلکے سروں میں غُرّاتے ہوئے دکان میں لٹکے گوشت کو للچائی نظروں سے گھورتے ہیں...اس تاک میں رہتے ہیں کہ کب قضاب ایک بیکار سی ہڈی یا گوشت کا ہلکا سا لوتھڑا اُن کی جانب پھینکے اور وہ اُسے حاصل کرنے ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔

وشال کو سماج میں بڑھتی ہوئی اخلاقی گراوٹ کی فکر ہونے لگی۔اُسے تو اپنے گاؤں کے راحیلہ آنٹی کی یاد آ گئی جو اپنے بیٹے مجید کے ساتھ اُسے بھی یہ درس دیا کرتی کہ عورت سے بات کرو بھی تو نیچی نگاہ رکھ کر۔وہ کہتی ''بیٹا استری کا کسی بھی طرح کا اپمان پاپ ہے اور یہ کہ نفس پر نظم وضبط ہی آدمی کو انسان بناتا ہے۔''

لنچ کے وقفہ میں حسب معمول پوجا ڈائننگ ٹیبل پر اُسکی سامنے والی کُرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔اُسکا لال گلال چہرہ دیکھ کر وشال کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کافی غصّہ میں ہے۔اُس نے اپنا ٹفن بکس بیاگ سے نکالا اور ٹیبل پر پٹخ دیا۔پھر وشال کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔''دیکھا تُم نے ان کُتّوں کے پِلّوں کو.....کیسے آوازیں کستے ہیں.....سیٹی بجاتے ہیں۔ان ندیدوں کو عورت میں طوائف یا رنڈی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔''اُسکی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑ رہے تھے۔

''شانت ہو جاؤ.....کھانا کھالو۔''وشال اُسے دلاسہ دینا چاہا۔

اُسکی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بولی۔''کل کے تمہارے سوال کا جواب تمہیں مل گیا ہوگا۔مَیں آج تمہیں یہی دکھانا چاہتی تھی''، تھوڑے توقف کے بعد وہ پھر کہنے لگی۔''مجھے اپنے عورت پن سے نہیں مرد کی اس فطرت سے نفرت ہے....اس کی اس جبلت سے نفرت ہے۔''پھر وہ ایکدم سے شانت ہو گئی،کھانا کھایا اور اٹھتے ہوئے بولی''مَیں آدھے دن کی چھٹّی پر گھر جا رہی ہوں۔''تھوڑی دیر تک وشال وہیں پر بیٹھا سوچتا رہ گیا کہ آخر وہ کیا سماجی، اخلاقی اور نفسیاتی عوامل ہیں جس کے زیر اثر مرد عورت کی نظر میں اس قدر گر جاتا ہے کہ وہ اُسے کُتّے کا پِلّہ،کمینہ یا ندیدہ کہہ سکے۔

اگلے دن پوجا روز کی طرح مشرقی لباس میں ملبوس تھی.....ڈھیلا ڈھالا چوڑی دار،سینہ ڈھانپتا ہوا ڈوپٹہ۔شام کینٹین میں چائے پیتے سَمے وشال کو پوجا کا موڈ خوشگوار نظر آیا۔وہ اپنے سینے میں دبا ہوا ایک سوال پوجا سے پوچھ ہی لیا۔''پوجا تمہیں تو مردوں کی فطرت سے نفرت ہے۔پھر مجھ سے دوستی؟''پوجا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پھر ہنسی روکتے ہوئے کہا۔''تم مرد ہی کہاں ہو''اور پھر ہنسنے لگی۔وشال کو پوجا کا یوں کھلکھلا کر ہنس پڑنا اچھا لگا۔وشال ایک پل کے لئے سوچنے لگا کاش پوجا یونہی ہنستی رہے اور یہ مدھر بھراسنگیت فضاؤں میں بکھرتا رہے۔اُسے لگا کہ اگر یہ معصوم پیاری سی لڑکی کی بند مٹھی کھل جائے تو وہ ایک بہتر دوست اور ساتھی ثابت ہو سکتی ہے۔اچانک پوجا سیریس ہو کر بولی''تُم ایک بہت اچھے انسان ہو وشال۔''

دن یونہی گزرتے رہے۔وشال اور پوجا کی دوستی کینٹین کی ٹیبل اور چائے پر رسمی گفتگو تک ہی محدود رہی۔ایک دن....وشال نے ہمّت جُٹا کر پوجا سے پوچھا۔''تمہارے گھر میں کون کون رہتا ہے پوجا؟''

''کیوں.....''پوجا کی پیشانی پر شکن ابھر آئے۔

وشال بڑے اطمینان سے بولا۔''ارے بھئی...دوست مانا ہے تو کچھ اپنے بارے میں کہو..کچھ ہمارے بارے میں سنو۔''

وہ مسکرائی۔بولی۔''اپنے بارے میں کہو۔''

''بھئی...مَیں تو یہاں اکیلا رہتا ہوں.....اسی آفس کے قریب

ایک کمرا لے رکھا ہے۔اسی میں رہتا ہوں.....بڑی مشکل سے کھانا بنانے والا کام انجام دے پاتا ہوں۔یہ دیکھو کئی جگہ سے میرے ہاتھوں پر آبلے آچکے ہیں۔'' وہ اپنے ہاتھ پوجا کے سامنے کرتا ہوا بولا۔پوجا ہنس پڑی۔وشال اپنی جیب سے موبایل نکالتے ہوئے بولا۔'' آؤ مَیں تمہیں اپنے ممی پاپا کی تصویر دکھاؤں جو گاؤں میں رہتے ہیں۔'' پھر وہ پوجا کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔'' ٹھہرو۔پہلے ایک سیلفی لیتے ہیں۔''

اُس نے پوجا کے ساتھ ایک سیلفی لی اور پھر گیلری کھولتے ہوئے وہ اپنے ممی پاپا کی تصویر پوجا کو دکھانے لگا۔پوجا تصویر دیکھتے ہوئے بولی۔'' تمہاری ممی تو بہت ہی خوبصورت ہیں اور پاپا بھی شاندار۔'' وشال گردن اکڑاتے ہوئے بولا۔'' میرے پاپا تو ریٹائرڈ ملٹری مین ہیں .....'' پھر تھوڑے توقف کے بعد بولا۔''میری ممی بہت اچھی ہے ....تم ملوگی نا تو بہت خوش ہوگی .....ممی پاپا چاہتے ہیں کہ مَیں اپنا گھر بسالوں۔''

''تو بسالو نا'' وہ رواداری میں بول پڑی۔

وشال اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر معنی خیز انداز میں بولا۔''کوئی لڑکی مجھے پسند بھی تو کرے۔''

پوجا کے چہرے پر سرخی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔اُسکی پلکیں آہستہ آہستہ گرنے لگیں اور پھر گردن بھی جھک گئی۔وشال کو ایک انجانی خوشی کا احساس ہوا۔ایک پل کے لئے اُسے لگا کہ اُسکے پنکھ لگ گئے ہیں اور وہ ہواؤں میں اُڑ رہا ہے۔کچھ لمحے یونہی گزر گئے۔پھر وشال نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولا۔''اب تم اپنی بتاؤ۔گھر میں کون کون رہتا ہے؟''

پوجا اُداس نظروں سے وشال کو دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔''اس بھری دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے.....سوائے ایک موسی کے جو مجھے جھیلتی رہتی ہے.... بیچاری!.....میری عمر کوئی نو سال کی رہی ہوگی ایک ایکسیڈنٹ میں میرے ممی پاپا کا دیہانت ہوگیا۔نو سال میری زندگی کا منحوس سال تھا.....'' پوجا کی آواز رندھیا گئی اور اُسکی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔اور پھر وہ ایک دم سے انجان خیالوں میں کھوگئی۔کسی بُت کی طرح ساکت.....نظریں ٹیبل پر رکھے ہوئے ایک خالی گلاس پر ٹکی تھیں۔وشال کو افسوس ہونے لگا۔اُس نے انجانے میں پوجا کے دکھتے تار چھیڑ دئے تھے۔

وشال سے پوجا کی یہ اُداسی دیکھی نہ گئی۔اُس نے اپنا ہاتھ اُسکے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔''سوری پوجا...مجھے تمہاری اس تریجڈی کا پتہ نہیں تھا۔''

''کوئی بات نہیں وشال۔'' وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی اور پھر اپنے گالوں پر لڑھکتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے وہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوگئی۔

وشال کو پوجا پر ترس آنے لگا۔یہ لڑکی اپنے دامن میں دکھ کے کانٹے سمیٹے ہوئے ہے۔ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت سے محروم اس لڑکی میں کچھ تو کرواہٹ ہوگی ہی۔اُسکا من کرنے لگا کہ کسی طرح وہ پوجا کی ساری کرواہٹ،اُسکے سارے دکھ اپنے سر لے لے اور بدلہ میں اُسکے اندر اتنی خوشی بھردے کہ وہ نہال ہوجائے۔

دوسرے دن لنچ کے وقفہ میں وشال پوجا کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔''پوجا ایک بات کہوں.....یہ بلیو کلر کا ڈریس تم پر بہت جچ رہا ہے...بڑا فرحت بخش رنگ ہے۔''

''اچھا جناب کو رنگوں میں بھی جانکاری ہے.....مَیں نے یہ ڈریس موسی کے اصرار پر پہنا ہے۔'' وہ ٹفن کھولتے ہوئے بولی۔

''ارے ہاں....ایک بات تو بتانا ہی بھول گیا۔مَیں نے ہماری وہ سیلفی ممی کو بھیجی تھی۔تمہیں دیکھ کر ممی بہت خوش ہوگئی.....اتنی خوش کہ ممی پاپا دونوں اس ویک اینڈ یہاں آرہے ہیں۔وہ تُم سے ملنا چاہتے ہیں...اور موسی سے بھی۔'' وشال سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

شاید پوجا وشال کے باتوں میں چھپا مفہوم سمجھ گئی تھی۔اُسکا چہرہ ایکدم سے گلابی ہوگیا۔چمچ پکڑی ہوئی انگلیاں تھرتھرانے لگیں۔نظریں نیچی جھکی ہوئی تھیں۔وشال اُسکی اس کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔''ممی تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہیں۔'' پوجا کے گالوں کی لالی کچھ اور گہری ہوگئی،شرم کے مارے گردن اٹھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔اُس دن پوجا جلدی سے اپنا کام نپٹا کر'بائی' کہتی ہوئی گھر چلی گئی۔چائے کے لئے بھی نہیں ٹھہری تھی۔

اگلے دو تین دن پوجا آفس نہیں آئی۔وشال کو تشویش ہونے لگی.....کیا بات ہوسکتی ہے؟اُس نے پوجا کے موبایل پر فون کیا...ناٹ ریچیبل.....واٹس اپ دیکھا..آن لائن آئے کئی دن ہوگئے تھے۔ویسے بھی اُسے سوشیل میڈیا میں دلچسپی ہی نہیں تھی۔میسیج کیا.....جواب ندارد۔وشال کو کچھ نہ سوجھا تو آفس سے پوجا کے گھر کا اڈریس لئے اُسکے گھر پہنچ گیا۔لیکن.....دروازہ پر تالا لگا ہوا تھا۔پڑوسیوں سے پتہ چلا وہ قریب ہی کے ایک ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔وشال کا دل بے تحاشہ ڈھڑکنے لگا.....کیا ہوا پوجا کو؟کہیں کچھ.....طرح طرح کے خیالات پریشان کرنے لگے۔وہ بھاگا بھاگا اسپتال پہونچا۔پوجا آئی۔سی۔یو۔میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھی۔وشال کی آنکھیں بھر آئیں۔

موسی آئی۔سی۔یو۔کے باہر بیٹھی ہوئی تھی.....اُداس.....سفید ساری میں ملبوس۔جب وشال کو پتہ چلا کہ یہی موسی ہے تو وہ اُس کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔'' موسی....مَیں پوجا کا دوست ہوں وشال۔''

''اوہ...وشال..اچھا ہوا تم آگئے ....بیٹا پوجا تمہارا ذکر کرتے نہ تھکتی تھی۔شاید تم ہی اُسکے ایک واحد دوست ہو.....'' موسی کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر ایک توانائی سی آگئی تھی۔

''پوجا کو کیا ہوا موسی؟'' وشال کی سوالیہ نظریں موسی پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''پگلی نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔''موسی نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

''خودکشی؟مگر کیوں....؟''وشال پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

'' ڈپریشن بیٹا....ڈپریشن۔وہ ایک عرصہ سے اس بیماری سے جوج رہی تھی۔نہ جانے کیوں دو چار دن سے اُس نے دوائی کھانا ہی چھوڑ دیا تھا۔بیٹا وہ تمہارا بہت ذکر کیا کرتی...دل کی گہرائیوں سے وہ تمہیں چاہنے لگی تھی.....لیکن..وہ بڑی بھاوک لڑکی ہے .....نہیں چاہتی کہ تم اسکی زندگی میں آؤ...''موسی کی آنکھیں بھر آئیں۔

''یہ کیا بات ہوئی موسی؟'' وشال بولا۔''آخر یہ کیا گتّھی ہے .....وہ مجھ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی۔''

موسی کو خاموش دیکھ کر وشال اصرار کرنے لگا۔''بتایئے نا موسی۔''

''بتاتی ہوں بیٹا۔تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں۔'' موسی نے بولنا شروع کیا۔''پوجا کوئی نو سال کی تھی.....اُسکے ماتا پتا کی موت کے بعد مَیں اُسے اپنے گاؤں لے آئی۔میرا گھر گاؤں کے ایک خستہ حال محلّہ میں تھا۔مَیں بیوہ تھی۔مجھے اپنے ساتھ پوجا کی بھی پرورش کرنی تھی،اُسے پڑھانا تھا.....مَیں چار پانچ گھروں میں کام کرنے لگی۔اُس دن پوجا کے چھٹّی تھی۔وہ ہوم ورک کرنے میں لگی رہی۔وہ بہت دنوں سے ایک گڑیا کی فرمائش کر رہی تھی۔مَیں کام سے واپسی پر اُسکے لئے ایک گڑیا اور کچھ ٹافیاں لئے گھر پہونچی۔گھر کے اندر داخل ہونے والی ہی تھی کہ اندر سے ایک بوڑھا دھوتی سنبھالتا ہوا باہر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی ایک طرف بھاگ نکلا۔میرا ماتھا ٹھنکا۔اندر جھانک کر دیکھا... پوجا کی کتابیں اور اُن کے پھٹے ہوئے اوراق سوکھے پتّوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے.....اور پوجا...خون میں لت پت بیہوش فرش پر چت پڑی ہوئی تھی.....

OOO

شاعری

غزل

رحمٰن جامی

تو نے دل توڑ دیا وعدۂ فردا کر کے
ہم تو پچھتائے بہت تجھ پہ بھروسا کر کے
وہی رسوائی وہی ذلّت و خواری کے سوا
کیا ملا ہم کو بھلا خواہشِ دنیا کر کے
ہم تو پہلے ہی محبت میں اکیلے تھے بہت
تونے بھی چھوڑ دیا ہے ہمیں رسوا کر کے
ہم کہیں کے نہ رہے تیری محبت کے عوض
رکھ دیا تو نے زمانے میں تماشہ کر کے
ہم تو سادہ ہیں ہر اک بات پہ کرتے ہیں یقیں
وہ مُکرتے ہیں سدا آپ ہی وعدہ کر کے
اپنی کوتاہیِ دامن کا کریں کیا شکویٰ
ہم ہی شرمندہ ہوئے اور تقاضا کر کے
دور تھے ان کے قریب آ کے ہوئے ہیں حیراں
کیسے انجان ہوئے ہیں وہ اشارہ کر کے
لوگ خوشحال ہیں دل اپنا لگا کے جامؔی
ہم ہی گھاٹے میں رہے پیار کا سودا کر کے

شاعری

غزلیں

مسلم نواز

وراثت میں ملا اک گھر ذرا سا
جھکا نا ہی پڑا یہ سر ذرا سا
ہوئی بارش نہا یا خوب جی بھر
کھلا تھا گھر کا جو چھپر ذرا سا
مرا اڑنا خلا میں خواب ہوتا
کتر لیتا اگر وہ پر ذرا سا
لہو میں تر بہ تر میں ہو گیا ہوں
چبھویا اس نے جو خنجر ذرا سا
بڑا مہنگا پڑا تھا ابرہہ کو
ابابیلوں کا وہ کنکر ذرا سا
بندھے ہیں بازوں پر اسمِ اعظم
نہیں آسیب کا اب ڈر ذرا سا
وہی انسان ہے بیدار مسلم
سنبھل جاتا ہے جو گر کر ذرا سا

آئینہ خود ہی خود شناس نہیں
اس کا چہرہ تو اس کے پاس نہیں
موسمِ سبز آ گیا پھر سے
ایک بھی پیڑ بے لباس نہیں
بعد ہجرت وہ لوٹ آئے گا
یہ یقیں ہے مرا قیاس نہیں
دردِ غم روز بڑھتا جاتا ہے
اب تو جینے کی مجھ میں آس نہیں
کس کی آہٹ سے چونک اٹھتا ہوں
کوئی کمرے کے آس پاس نہیں
اب نہیں آتیں تتلیاں مسلم
پھول سوکھے ہیں ان میں باس نہیں

غزلیں

احسن رضوی

یہ کرم اللہ کا کچھ کم نہیں
سر مرا آگے کسی کے خم نہیں
جانے کب آنکھوں کو دے جائیں نمی
آنسوؤں کا اب کوئی موسم نہیں
ہمسفر کوئی نہیں یہ غم تو ہے
لیکن اس احساس کا ماتم نہیں
یوں تو کیا کچھ ہے میسر ان دنوں
مرے زخموں کا مگر مرہم نہیں
گاہے گاہے یاد اس کی آئے ہے
درد رہتا ہے مگر پیہم نہیں
ایک مدّت سے غزَ کا ہوں اسیر
فکر کی لیے آج بھی مدھم نہیں
یاد تو کرتے ہیں اک دوجے کو ہم
ربط لیکن ان دنوں باہم نہیں
غور کرنے پر سمجھ میں آئے گا
شعر احسن کا کوئی مبہم نہیں

بی ایس جین جوہر

جنگل، جنگل، بستی، بستی، پھرتا مارا مارا
گاتا، بجاتا، ہنستا، روتا اک شاعر بے چارا
گانوں، گانوں میں گلی گلی میں اس کے نغمے گونجیں
امن واماں کا پیغمبر ہے گیتوں کا بنجارا
جو مل جائے کھا کر خوش ہے گر نہ ملے تو کیا غم
لوگوں کے دل جیت لیے ہیں اپنا سب کچھ ہارا
جگہ جگہ پر قتل، ڈکیتی، دھوکہ، ریپ، رہزنی
خون کے آنسو روتا ہے وہ دیکھ کے یہ نظارہ
موم کے جیسا دل ہے اس کا عزم مگر فولادی
کوئی بھی احسان کسی کا خود پر نہیں گوارا
مذہب ہے آفاقی اس کا آدمیت ہے مسلک
ہندو مسلم، سکھ، عیسائی سب کا ہے وہ پیارا
قدرت کا شہکار ہے شاعر شعر وسخن کا ماہر
جیسے خدا نے کوئی فرشتہ دھرتی پر ہوا اُتارا

شاعری

غزلیں

محمد شاہد پٹھان

خوف و دہشت کا یہ ماحول بدلنا ہوگا
ناتواں لوگوں کو فولاد میں ڈھلنا ہوگا
لوگ کہتے ہیں مجھے رستہ بدلنا ہوگا
مجھ کو بھی ضد ہے کہ طوفان کو ٹلنا ہوگا
حق و باطل کی وہی معرکہ آرائی ہے
سر ہتھیلی پہ لیے گھر سے نکلنا ہوگا
جن کی تقدیر میں لکھی ہے غریب الوطنی
ایسے بچوں کو تو افلاس میں پلنا ہوگا
وقت کی قدر نہیں کی تو میرے ہم وطنو!
زندگی بھر کفِ افسوس ہی ملنا ہوگا
خواب بچوں کے مکمل نہیں ہونے والے
ان کو مٹّی کے کھلونوں سے بہلنا ہوگا
اس سے پہلے کہ ڈبو ڈالے ہمیں موج بلا
ہم کو طوفاں کے ارادوں کو بدلنا ہوگا
بے گناہوں کا یہاں کون ہے قاتل شاہدؔ
ایک دن وقت کو یہ راز اگلنا ہوگا

آرزو پر شباب آتا ہے
جب وہ رشکِ گلاب آتا ہے
خوف و دہشت کی حکمرانی میں
اک دن انقلاب آتا ہے
جب زمیں پر گناہ بڑھتے ہیں
آسماں سے عذاب آتا ہے
ساتھ رہتی ہے جب سفر میں دعا
ہر کوئی کامیاب آتا ہے
کوئی مقصد ہو کوئی منزل ہو
راستوں میں سراب آتا ہے
ہم جو نرمی سے بات کرتے ہیں
تلخ ان کا جواب آتا ہے
میں زمیں سے سوال کرتا ہوں
آسماں سے جواب آتا ہے
ذکر جب جب چھڑا ہے خیبر کا
یاد وہ ''بو تراب'' آتا ہے
دست بستہ ہے ہر کوئی شاہدؔ
کون عزت مآب آتا ہے!

شاعری

نظم

مصداق اعظمی

توبہ

دور مسجد سے ہے بہت
لیکن
اس کو قربِ خدا کی حسرت ہے
بے وضو ہے زباں
شرابی کی
پھر بھی ذکرِ خدا میں شامل ہے
اس کے بارے میں آیتیں پڑھ کر
اس کے دل کو سکون ملتا ہے
اپنے احساسِ شرمساری کو
اہلِ دنیا سے بھی چھپاتا ہے
دل ہی دل میں
وہ وقتِ فرصت میں
اس کی رحمت کے گیت گاتا ہے
کر کے اکثر تلاش تنہائی
بیٹھ جاتا ہے وہ مصلے پر
عزم کرتا ہے
پھر نہ پینے کا
پھر نئی شام لڑکھراتی ہے
روز کرتا ہے
اک نئی توبہ
اور توبہ ہے ٹوٹ جاتی ہے
اس کی امید
پاک دامن ہے
داغِ مئے جو چھپائے رکھتی ہے
اس کو امید ہے
یہی اس سے
یہ ریاضت نہ رائگاں ہوگی
اپنے دل کی کثافتیں ساری
صاف کر لے گا
نصف شب رو کر
اس کی توبہ قبول کر لے گا
وہ غفور الرحیم ہے
اتنا
بخش سکتا ہے
ہر خطاء اس کی

شاعری

غزلیں

پی پی سریواستو رند

اپنوں کے احسان کو لائے کاندھوں پر
ننگے پاؤں چلا ہوں جلتی سڑکوں پر

گھر کی دیواروں پر دیمک نے
جانے کتنے شعر لکھے دروازوں پر

کبھی کون ہجرت کا احساس نہ تھا
بے سمتی نے جنوں لکھا تھا چہروں پر

دونوں بازوں، دونوں کاندھے زخمی تھے
سر تو کب کا رکھ آئے تھے نیزوں پر

آسمان پر سورج کو چسپاں کر کے
چلتا ہے ہر روز کوئی انگاروں پر

پورے گھر پر رشتے ناطے قالص تھے
گھر کا وارکھوم رہا تھا سڑکوں پر

ہجرت کی تو خواب سنہرے دیکھتے تھے
وقت نے پانی پھیر دیا ارمانوں پر

غزل طرح میں، عمر چھیاسی بوڑھا رندؔ
چست قوانی برس پڑی ہم جیسوں پر

مسعود جعفری

بھری بہار میں اپنے مکان جلتے ہیں
نہ چھوڑتے ہیں نہ اپنا وطن بدلتے ہیں
ہرا ہرا سا ہے موسم چلو کہ چلتے ہیں
کسی حسین سی آواز سے بہلتے ہیں
انہیں تلاطم دریا کا ہے پتہ لیکن
مچھیرے کشتیاں لے کر ہی تو نکلتے ہیں
لکھے ہوئے ہیں مرے شعر تیرے ٹیٹو پر
بہت سے شعر ترے ہونٹ پر مچلتے ہیں
انہیں پتہ ہی نہیں آندھیاں ہیں پیڑوں پر
یہ کون لوگ ہیں قندیل لے کے چلتے ہیں
عطا ہوا ہے مجھے تخت و تاج غزلوں کا
زمانے دیکھ کے حسرت سے ہاتھ ملتے ہیں
مری خبر بھی مجھے مدتوں نہیں ملتی
تمہارے غم جو مری شام غم میں ڈھلتے ہیں
یہ اور بات کہ جلتی ہیں انگلیاں میری
تمہاری یاد میں سگریٹ جب بھی جلتے ہیں
کبھی جو شہر سے آتا ہے فون لڑکی کا
ہمارے گاؤں میں فتنے ہزار پلتے ہیں

شاعری

غزلیں

شبانہ عشرت

کسی خوشبو کی طرح یونہی بکھر جانے کی
میری معصوم دعا دل میں اتر جانے کی

دل لگی یوں ہی ذرا اس نے کبھی کی ہوگی
بات ایسی تو نہ تھی جاں سے گزر جانے کی

سحر انگیز ہے طیبہ تری گلیاں کتنی
سوچتا کون ہے اب لوٹ کے گھر جانے کی

یہ تو سب کھیل ہے تقدیر کا دنیا والو
کس کو خواہش ہے بھلا ایسے بکھر جانے کی

آپ بے وجہ پریشان ہیں عشرت ورنہ
میرے زخموں کو تو عادت نہیں بھر جانے کی

ہر اک شام کا منظر وہی پرانا تھا
کہ ڈھلتے وقت تو سورج کو سر جھکانا تھا

نظر تو آتا وہی جو تمہاری صورت تھی
مرا قصور تو بس آئینہ دکھانا تھا

ہوا کا رخ بھی جو بدلا تو اس طرح بدلا
وہیں پہ بجلی گری تھی جہاں ٹھکانہ تھا

نظر کی کاٹ سے دل پہ وہ ضرب پڑی تھی
کہ جیسے زخم نہاں پر نمک سجانا تھا

وہ درد کے لمحے ہیں پہلوئے دل میں
مگر کسی کے لیے پھر بھی مسکرانا تھا

گلوں کے سینے پہ شبنم کی بوند ہی رکھتے
کہ دل کی آگ کسی طور سے بجھانا تھا

تھپیڑے کھا کے جو طوفاں سے پار پا ہی گیا
اسی کے قدموں تلے سمجھو یہ زمانہ تھا

معین الدین عثمانی

مطالعہ

ہم زاد سے راست مکالمہ کرنے والا مجموعہ ''خوابگینے''

اردو میں افسانے کی روایت اب دو صدیوں پر محیط ہے۔مگر اس کے باوجود فکشن کے ناقدین کو شکایت رہی ہے کہ اردو افسانہ عالمی سطح تک نہیں پہونچ سکا ہے۔اسی لیے جب بھی افسانے کی گفتگو ہوتی ہے تو ناقدین کا ادبی کارواں ترقی پسندوں کے جمگھٹے سے آگے نہیں بڑھتا۔ ویسے دیکھا جائے تو اس معاملے میں ترقی پسندوں کا تشہیری حربہ بھی ان کے حق میں بڑا کارگر ثابت ہوا ہے۔ یہاں یہ بات بھی خاطر نشاں رہے کہ ان کے کام سے کسی کو انکار نہیں ہے مگر تحریک کے ختم ہو جانے کے بعد بھی ناقدین کا پرانی لکیروں کو پیٹنا کسی صورت مناسب نہیں اور کارواں کے بعد آنے والے گروہ کو یکسر نظر انداز کرنا تو ظلم کے مترادف ہے۔

آزادی کے بعد جدیدیت کے پرچم تلے کچھ افراد نے افسانے کی ناو کو ایک عرصہ تک سنبھالا دیا مگر ان کے غیر متعلق موضوعات نے زیادہ دور کا سفر کرنے سے انھیں باز رکھا تو وہ بھی غیر محسوس طریقے سے کنارے جا لگے۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں کسی چیز کو ثبات نہیں ہے ہر کوئی محو سفر ہے تو پھر بھلا افسانہ کہاں ٹھہرنے والا تھا اس کا کارواں زندگانی کی ترجمانی کرتے ہوئے آگے بڑھتا گیا۔ کارواں میں ہر پل نئے نئے مسافر شامل ہوتے گئے اور ایک نیا افسانوی جہاں آباد ہوتا گیا۔اسی نئے افسانوی کرہ کے بلند حوصلہ مسافر کا نام ہے شاہد اختر جو اپنی فنی جلوہ سامانیوں سے افسانہ دیار میں طرح طرح کے رنگ بکھیر کر اپنے وجود کا لوھا منوا رہا ہے۔

معروف نقاد مہدی جعفر اس کے تعلق سے یوں رقم طراز ہیں'' شاہد اختر کے افسانے لمحہ موجود میں سانس لیتے ہیں۔ ان کے یہاں آج ہے اپنی پوری شدت کے ساتھ آج کی تلاش ہے خواہ امروز کے تہذیبی نشیب میں اتر جانے کا مظاہرہ ہی کیوں نہ کر رہی ہو۔ان کے یہاں اگر کہیں گزرتے ہوئے کل کی جھلک ہے تو یہ شکل آج کے آئینے میں نظر آتی ہے۔

آج کے اس پیچیدہ معاشرے میں فرد ایک اکائی میں تبدیل ہو کر اپنے آپ سے برسرِ پیکار بلکہ جنگ میں مصروف ہے۔اس کی سوچ وفکر زندگی کا ہر (عمل ادکی ذات کے گرد مرتکز ہو گیا ہے۔ سماج میں رہتے ہوئے بھی تنہائی کے عذاب سے دوچار ہے ایسی صورت میں معاشرے کی جو کنجلک تصویر ابھر رہی ہے۔اس کا عکس جا بجا ان کی کہانیوں میں اپنی داستان رقم کر رہے ہیں۔اور اردو افسانے کا نیا باب وا کر کے عالمی ادب کو آنکھیں دکھا رہے ہیں۔شاہد اختر کا یہ اعترافیہ ہے کہ ''میرا ہم زاد بارہا مجھ سے بڑے عجیب سوالات کرتا ہے اس مجموعہ کے تمام افسانے ہمزاد کو دیئے گئے جوابات ہیں۔ میرے جوابات سے وہ مطمئن بھی ہے۔ اس کی تسلی واطمینان میری ترجیحات میں شامل ہے۔ کیوں کہ اس طرح مجھے بھی کچھ راحت نصیب ہو جاتی ہے۔

تاریخ منطق وفلسفہ سے ان افسانوں کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے اس لیے نہیں کہ یہ علوم افسانے کے لیے زہر قاتل ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان افسانوں کے نحیف وکمزور شانے ان کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔''

شاہد اختر کے مطابق ہر افسانے میں ہمزاد موجود ہے جس طرح کسی عاقل کے پاس موکل ہوتا ہے اور اس سے طرح طرح کے کام لیتا ہے عین اسی طرح وہ اپنے ہمزاد کے روبرو زندگی

کے مسائل پیش کر کے اس پر گفتگو کرتے اور مسائل کے حل کی طرف نشاندہی فرماتے۔ کیوں کہ مسائل کو آشکار کرنا قلم کار کی ذمہ داری تو ہوسکتی ہے مگر حل کے لیے معاشرے کو ہی پیش قدمی کرنا ہوتا ہے۔

خوابگینے میں شامل تمام تر افسانے موجودہ دور کے افسانے ہیں۔ان میں آپ کو نہ تو گل وبلبل کے قصے ملیں گے نا ہی رومان کی داستانیں۔ بلکہ یہ کہانیاں آپ کو اپنے آس پاس کی بکھری ہوئی کہانیاں محسوس ہوں گی۔ میں تو یہ بھی کہنے کا مجاز ہوں کہ ان میں آپ کو خود اپنا عکس بھی نظر آئے گا۔ جسے دیکھ کر حیران و پریشان ہونا فطری ہے۔ اور میرے خیال سے یہ وصف ہی انھیں ریوڑھ سے الگ کرنے کے لیے کافی ہے۔خوش آئند بات یہ ہے کہ ہر افسانے کے تانے بانے انسانی رشتوں کے درمیان ہی گردش کرتے ہیں جس کے سبب افسانے چونکانے کی بجائے قاری کو متحیر کر کے غور وفکر پر آمادہ کر دیتے ہیں۔

''دروبام''اس افسانے کی یہ سطریں ملاحظہ فرمائیں:

''بیوی بچوں کے آتے ہی درو بام کی نحوست غائب ہوگئی۔ مکان اور گھر کے درمیان۔عورت ہی حائل ہوتی ہے۔مرد اس میں کچھ بنا بگاڑ نہیں سکتا۔'' کہانی کے عروج میں انسانی نفسیات کا غیر معمولی دخل ہوتا ہے جو قلم کے سپاہی اس راز کو پا لیتے ہیں زندگی کے پے چیدہ مسائل کی گرہ بھی بہ آسانی کھول سکتے ہیں۔اور یہ ہنر شاہد اختر کے افسانوں میں جگہ جگہ محسوس کیا جاتا ہے۔لگتا ہے قدرت نے اس معاملہ میں ان کے تئیں فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے۔ افسانہ''تجویز'' کی یہ سطریں اس بات کی ضمانت دیں گی۔''اس جگہ سے دفاع کے صرف دو ہی راستے بچے ہیں۔ پہلا یہ کہ آپ صحرا کی طرف کوچ کر جائیں۔جنگل میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ شہر اور اس کے درمیان حدود کا امتیاز ختم ہوگیا۔اور افسانہ'' حساب'' کا یہ فقرہ کہ''تم نے کبھی سوچا ہے کہ اللہ رب العزت تم سے کس چیز کا حساب لے گا''

یہ اور اس قبیل کے بے حساب جملے قاری کو لمحہ بھر کے لیے سہی روک کر غور وفکر پر آمادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جو ان کی فنی بلوغت کے ساتھ ذہنی وسعت کو بھی آشکارہ کرتے ہیں۔

خوابگینے میں شامل زیادہ تر کہانیوں کی خوبی یہ ہے کہ کہانی کے ساتھ بین السطور میں ایک دوسری کہانی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔قاری کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کے ذہن پہ کون سی تحریر اثر انداز ہو رہی ہے۔اور میرے خیال سے یہ تحریر کی فنی بلوغت کی علامت ہے۔اس ضمن میں ان کا افسانہ''کتّے'' کی مثال دی جاسکتی ہے کہ روز مرّہ کے ایک معمولی واقعے کے توسط سے انھوں نے مسلم معاشرے کی بین الاقوامی سطح پر تصویر کشی کی ہے۔ جسے دیکھنے کے لیے تیسری آنکھ کی ضرورت ہے جو موجودہ فکشن نقادوں کے پاس نہیں ہے۔ان کی عینک گزیدہ آنکھیں گنتی کے چند ناموں کے علاوہ کچھ اور دیکھ نہیں سکتیں۔

شاہد اختر عجلت پسندی کے قائل نہیں ہیں۔ان کی کہانی بڑی آہستگی سے آگے بڑھتی ہے۔ یوں لگتا ہے گویا کہ وقت ٹھہر سا گیا ہے۔مگر جب وہ نفسیات کی سیڑھی کے سہارے اختتام کو پہنچتے ہیں تو قاری کے دل ودماغ سے ایک چنگاری نکلتی ہے جس کی سوزش سے وہ تادیر بے چین رہتا ہے۔ بظاہر کہانی ختم ہو جاتی ہے لیکن ایک دوسری ان دیکھی کہانی روبرو ہو کر زندگی کا محاسبہ کرنے لگتی ہے۔ بڑی تحریر کی یہ خوبی گردانی گئی ہے کہ اس کے لفظ لفظ اور سطر سطر سے اپنے پن کا احساس جھلکتا ہے۔ جہاں اپنائیت در آئے تو رشتہ میں مضبوطی کا آنا فطری بن جاتا ہے۔اور شاہد اختر کی ہنرمندی نے جگہ جگہ اس جادو سے اپنے افسانوں کو مالا مال کیا ہے۔

جہاں تک افسانوں کی زبان و بیان کا تعلق ہے زبان

نہایت صاف وشستہ اور بامحاورہ ہے۔جس کے سبب کردار زندہ اور قاری سے راست مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔

انسانی زندگی میں پیٹ کی بھوک کے بعد جنسی بھوک کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ان ہی کی بنیاد پر زندگی میں ہنگامے ہیں۔ان کی تسکین کی خاطر قدرت نے کچھ ضابطے مقرر کیے ہیں۔ جب انسانی معاشرہ ضابطوں کے حدود میں رہتا ہے سماج میں امن و چین کی دیوی کا راج رہتا ہے۔لیکن جب کبھی ان ضابطوں کی پامالی ہوتی ہے تو معاشرہ کا رخ جنگل کی تصویر بن جاتا ہے۔ایسے ہی حساس موضوعات کو ان کے یہاں جس سلیقے کے ساتھ ایک انوکھا موڑ دے کر پیش کیا گیا ہے جس کی مثال دیگر مقامات پر خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔شجر ممنوعہ قرار دیا گیا یہ موضوع کو ہنر مندی سے منٹو اور بیدی شاید انھیں کا حصہ ہے۔

منٹو اور بیدی کے بعد کیا فسانے کی گمشدگی کی شکایت کرنے والوں کی نظریں جب اس خاموش طبع فنکار کی جانب جائیں گی تو یقینی طور پر یہ احساس ہوگا کہ افسانہ نگاروں کی اس بھیڑ میں ایک سنجیدہ قلم کار شاہد اختر بھی ہے۔جو ''خوابگینے'' کے موتیوں سے افسانہ محل کو روشن اور تابندہ کر رہا ہے۔واٹس اپ اور فیس بک کی اس دنیا میں تحریر کی سکڑتی اور دم توڑتی حالت کو جلا بخشنے کی خاطر خوابگینے'' ے کی پذیرائی اردو حلقہ کا ادبی فریضہ ہے۔

ooo

بیگ احساس

کا

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ

افسانوں کا مجموعہ

دَخمہ

قیمت: -/200 روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵

تبصرہ

جوگندر پال کی افسانہ نگاری

ماہر پال ابوظہیر ربانی مابعد جدید محقق و ناقد ہیں۔ انہوں نے بیسویں صدی کے ادبی ثقافت کے پیکر جوگندر پال کے کائناتی شعور کے احساس کو عصرِ حاضر کے معاشرتی تقاضوں کو موضوع بنایا ہے۔ان کی تحریروں کی باطنی فضاء کی وسعت اور کثیر الجہتی کو بڑی صفائی کے ساتھ صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا۔ جوگندر پال کی تخلیقات میں دھرتی کا کال (1961ء)، میں کیوں سقیم؟ (1962ء)، کھودو بابا کا مقبرہ (1994ء)، پرندے (2000ء) (سبھی افسانے)، نہیں رحمان بابو (افسانوں کا مجموعہ جس میں کچھ دوسطری تھے)، آمدورفت (1975ء)، بیانات (1975ء) (دو مختصر ناول)، بے محاورہ (1978ء)، بیارادہ (1981ء)، نادید (1983ء)، خواب رو (1991ء) (دونوں ناول) زیادہ مشہور ہوئے۔ کہنے کو یہ کتابیں ادبی تاریخ کا حصہ ہیں۔لیکن حقیقت میں جوگندر پال کی روح ہے۔

جوگندر پال کی زبان بہ محاورہ،ضرب المثال سے پر ہے۔جس سے عام قاری یا طالب علم سرسری مطالعے سے نہیں سمجھ سکتا اس غرض سیا بوظہیر ربانی نے جوگندر پال کی شخصیت اور فن و فکر کو مختصر سادہ سہل انداز میں متعارف کیا ہے۔ان کی یہ تحریریں جوگندر پال پر تحقیق کا نقطہ بن رہی ہیں۔ ابوظہیر ربانی کی کتاب "جوگندر پال کی افسانہ نگاری" تین ابواب پر مشتمل ہے۔ مضامین کی زمرہ بندی 'مقدمہ' سیا بتدا ہے۔ پہلے حصہ میں 'جوگندر پال: شخصیت اور عہد' کے تحت ذیلی ابواب میں ' حالاتِ زندگی، معاصر ادبی صورت حال' اور ' تخلیقی سفر اور اہم تخلیقی کارنامے' ہے۔دوسرے حصہ 'جوگندر پال کے افسانے: فکری وفنی تجزیہ' کے ذایلی ابواب میں 'سماجی ، تہذیبی اور فکر ی فضا'، ' فنی و تکنیکی جہتیں '، 'پلاٹ، کردار، زبان اسلوب ' اور ' تکنیک ' پر محیط ہے۔آخری حصہ ' جوگندر پال کی انفرادیت' کے ذیلی ابواب میں موضوع،فکر اور فن ہے آخر میں کتابیات درج ہے۔اس طرح مکمل کتاب پر خوبصورت اور جاذِب نظر عالمانہ تجزیہ ہے۔بالخصوص سماجی شعور کے رموز،افسانوں کی کارکردگی کی تفصیل، سماجی اور تہذیبی پس منظر میں ان کی بنیادی فکر وفن کی وضاحت لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ثبوت میں جوگندر پال نے خود لکھا ہے 'نئے ادبا کو ہی اپنا ادبی دور تخلیق کرنا ہوتا ہے اور اس کے لیے انہیں اپنے دور میں پنپتی ہوئی نئی اور مختلف سچائیوں کے آزادینہ تخلیقِ احساس و ادراک کے بغیر چارہ نہیں۔ جس مقصد کے تحت کرشن چنر، بیدی اور منٹو نے اپنے عہد کے مطابق افسانے کو نیا موڑ دیا ،اسی مقصد کی انجام دہی کے لیے میرے لیے بھی ملازم تھا کہ اپنے دور کی مخصوص سچائیوں کے اظہار کے لیے مخصوص اسلوب اختیار کروں، اس طرح قارئین کو بھی اگر نئی کہانیوں میں اپنے زمانے کی مانوس چاپ محسوس ہونے لگے تو وہ ان سے جڑ جاتا ہے۔

ابوظہیر ربانی عصر حاضر کے منفرد ممتاز محقق اور زبان و ادب کیا سرار و رموز سیآشنا شخص ہیں۔مصنف نے اپنے فہم وادراک اور وسیع النظری سے موضوع کا پوری طرح حق ادا کیا ہے۔ جوگندر پال کی بصیرت کی راست آگہی اور ان کے مابعد جدید افکار کو اپنی تخلیق کے کوزے میں سمویا ہے۔جو غیر معمولی کاوش تھی۔اس کا عکس اس اقتباس میں دیکھا جاسکتا ہے:

جوگندر پال نے فنی اور تکنیکی وسائل سے بلیغ انداز میں کام لیتے ہوئے افسانے میں فکری تہہ داری پیدا کی ہے۔ان کے بیشتر افسانے قرات اور تعبیر کی نت نئی جہتیں رکھتے ہیں اور انہیں ہر قاری ایک نئے سیاق میں پڑھ سکتا ہے۔ان کے افسانوں میں ثقافتی تغیرات سے متعلق مظاہر کرداروں کے جلو میں اس طرح

نمایاں ہوتے ہیں کہ قاری کی حسیت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ بیدی کے بعد کی نسل میں جوگندر پال ایسے پہلے افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں قدیم ثقافتی تناظر پر مبنی بیانیہ یعنی اساطیر متن میں مرکزیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ یہ اساطیر تناظر ہم عصر دنیا کے تضادات اور مسائل کے تجزیے کا نیا سیاق سامنے لاتے ہیں اور افسانے کو نئی معنویت سے ہمکنات کرتے ہیں۔

جوگندر پال نے فکری سطح پر خود کو منفرد تو بنایا ہی ، موضوعات، کردار، زبان واسلوب اور تکنیک میں بھی انفرادیت کا ثبوت دیا۔ افسانوں کا بنیادی وصف تو یہی ہے کہ اس میں افسانویت ہونی چاہیے۔لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کہانی کار نے کہانی میں زندگی کے تجربات کو کیا اس طرح پرویا کہ وہ قاری کے تجربا ومشاہدات سے مس ہوکر اس کی بصیرت مین اضافے کا سبب بن سکے۔اس لحاظ سے جوگندر پال ایک کامیاب فنکار ہیں کہ ان کی کہانیوں میں مشاہدہ بھی ہے اور تجربہ بھی اور قاری کے تجربے اور مشاہدے کو مس کرنے کی صفت بھی۔

جوگندر پال بیک وقت میں ماہر فکشن، بہترین ادیب، انشاء پرداز، تاریخ نویس، مذہبی رہنما، معاشرتی رہبر، قیادت و ثقافت کا ایک معتبر مفکر، عمدہ خطابت کرنے والا فلسفی اور متنوع جہات بے مثال شخصیت کے مالک ہیں۔اسی لیے ابوظہیر ربانی نے اس معتبر قلم کار و پر کتاب لکھ دی جو کم الفاظ میں زیادہ معلوماتی ہے۔چاہیان کے شخصی مضامین ہو یا ان کی فکری بصیرت ہر گوشے کو منفرد انداز میں اختصار سے بغیر انگریزی حوالوں کے تکرار سے پاک ہے۔اس تصنیف کا اسلوب، لفظیات ،زبان و بیان یا اصطلاحوں کو بہتیرن انداز سے برت کر سہل انداز میں سلیقہ کے ساتھ کتابی شکل دی۔ یہ کتاب جوگندر پال کی فکر وفن کو سمجھنے کا اعلیٰ نمونہ اور موثر ذریعہ ہے۔اس کتاب کا متصوّرہ نقطہ یہ ہے جتنی اچھی ترتیب ہے اتنے ہی اچھے سلیقے سیآپ کی شخصیت کو مختصر اور جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

جوگندر پال کی شخصیت فکشن پروردہ کے نام سے جانی اور مانی جاتی ہے۔ماضی میں اردو کے اہم فکشن نگار بیشتر قلم کاروں نے آپ کیادبی خدمات کو اردو دنیا کے روبرو پیش کیا ہے۔لیکن ابو ظہیر ربانی نے فن اور شخصیت کے علاوہ ان کے افسانوں کی فکری و فنی اہم نکات کو سریع الفہم انداز میں گراں قدر وضاحت کی ہے۔ جو شاید آئندہ کسی کو نصیب ہو۔ایسی کاوشوں سے ہی ادب مستند ہوتا ہے۔پچھلے دنوں علامہ شبلی نعمانی نے 'موازنہ انیس و دبیر' لکھا تو ادب کا حصہ بن گیا۔وہی کام ابوظہیر ربانی نے اس تخلیق سے کیا ہے۔ کیوں کی اردو داں طبقہ جوگندر پال کی افسانہ نگاری سے تو وقف ہے لیکن ان کے فکر وفن سے کوسوں دور ہے۔اس اعتبار سیہ تصنیف اپنے آپ میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے، اسلوب معیاری ،طرز ادادل کش، زبان و بیان نقص سے پاک ،پُر لطف معلوماتی، جامع سلیس اور عام فہم جملوں کا استعمال کیا ہے۔ جس میں جوگندر پال کے مخصوص حوالے اور ان کے فن کو جدید افکار سے صداقت کے ساتھ خود مصنف نے اپنیمشاہدات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔اس طرح لکھی جانے والی یہ پہلی معتبر کاوش ہے۔مصّنف کی یہ تصنیف ایک آئینہ کے دو عکس ہے ایک جوگندر پال کی شخصیت دوسرے ان کے فکر وفن کا علمیانہ تجزیہ جس سے یہ کتاب ایک توانا گم گشتہ پہلو کی بازیافت اور جوگندر پال شناسی کی عمدہ مثال ہے۔ یہ تخلیق مصنف کے وسیع مطالعے، گہرے تفکر اور تحقیقی کدو کاوش کا بین ثبوت ہے۔توقع ہے یہ اس کاوش کو علمی حلقہ میں تحسین کی نظر سے دیکھا جائیگا اور اس پر غور وفکر کے نئے دریچے بھی کھولیجائیں گے۔کیوں کہ جوگندر پال کا تخلیقی کام اتنا زیادہ اہم اور قابل قدر تھا کہ اس کی قدر و قیمت پر ایماندارانہ نظر ثانی کی ضرورت تھی۔ اس کمی کو ابوظہیر ربانی نے مکمل کی۔مبصر کو امید ہے کہ جوگندر پال کی وفات کے بعد ہمارے علمی وادبی حلقوں میں اس کام کی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے محنت اور دیانت کے ساتھ پیش کی گئی یہ کاوش اہم ثابت ہوگی۔

OOO

(مراسلہ نگار کے خیالات سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

جو وہ لکھیں گے جواب میں

محترم بیگ احساس صاحب آداب سلام تسلیمات!

''سب رس'' دسمبر ۲۰۱۸ء ملا۔ اللہ آپ کو خیر و عافیت سے رکھے۔ آمین۔

گلزار جاوید کا افسانہ ''مولانا گاؤدی'' پڑھا۔ یہ بلند اقبال کے ناول ''ٹوٹی ہوئی دیوار'' سے متاثر ہو کر تحریر کیا گیا ہے۔ کلائمکس مطمئن نہیں کر سکا۔ مسئلہ وہی پرانا۔ پاکستان میں مذہبی جنونیوں کی وجہ سے جو عذاب نازل ہو رہا ہے۔ اسے پاکستان سے باہر جا کر دکھایا جا رہا ہے۔ افسانے میں تبلیغ نہ کرنے اور مذہب پر عمل پیرا ہونے کے جو جواز تراشے گئے ہیں وہ معقول نظر نہیں آتے۔ دوسرا افسانہ ''عشرتِ قطرہ ہے'' اپنے افسانے کے متعلق رائے محفوظ رکھتا ہوں۔ تیسرا افسانہ مشتاق احمد وانی کا ''غشی'' ہے جو اپنے اختتام کو نہیں پہنچ پایا۔ راستے میں کہیں گم ہو کر رہ گیا۔ واقعہ میں جھول ہے۔ بنت ڈھیلی ڈھالی ہے۔ جملہ ملاحظہ فرمائیے: ''یہ میرے نبیؐ کی سنت نہیں رہی ہوگی؟'' جملہ یوں ہونا چاہیے تھا: ''یہ میرے نبیؐ کی سنت نہیں ہے۔'' کیا ایک پرنسپل کو یہ پتہ نہیں ہے کہ اسے اپنے کارڈ کا کوڈ نمبر کسی کو نہیں بتانا چاہیے؟

انقلاب حسین کی سوچ کو ذہن میں رکھ کر کلائمکس لکھا جا سکتا تھا۔ شاہد حسین زبیری کا تحریر کردہ خاکہ، خاکے کے زمرے میں نہیں آتا وہ خاکہ کے لوازمات سے ناواقف ہیں۔

عارف خورشید۔ اورنگ آباد

مکرمی!

سب رس ماہ جنوری ۲۰۱۹ء کا شمارہ وقت پر ہمدست ہوا۔ مدیر صاحب نے اداریہ میں حسب روایت ہندوستان میں رونما والے حوادث و حادثات کو موضوع بنایا انھوں نے 30/جنوری کی قومی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پورے ہند میں 30/جنوری کو گاندھی شہید ہونے پر 11 بجے 2 منٹ کی خاموشی مناتے ہیں لیکن 30/جنوری ۲۰۱۹ء کو علی گڑھ میں جو واقعہ ہوا ہے ہندوستانی روایت پرم پرا کے خلاف عمل ہے ناتھورام گوڈسے کو خراج پیش کیا گیا۔ پروفیسر بیگ احساس نے ہندوستان کے عوامی حالات کو چشم دید گواہ کے طور پر پیش کرتے ہیں جیسا کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور عکاسی کی ہے سب رس جنوری ۱۹۳۸ء سے شائع ہو رہا ہے میکش حیدرآبادی اس کے پہلے مدیر تھے انھوں نے سب رس شائع کیا بعد میں ڈاکٹر زور اس کے مدیر بنے اس طرح یہ رسالہ اردو زبان و ادب کی بے پایاں خدمت انجام دے رہا ہے جب سے پروفیسر بیگ احساس اس کے مدیر بنے اس وقت سے رسالے کا سیٹ اپ گٹ اپ خوب صورت اور دل چسپ ہو گیا ہے۔ ہر شمارے کے مشمولات بھی فکر انگیز اور معلومات سے مزین ہوتے ہیں مقالے اپنے اندر بھرپور معلومات لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ذیلی عنوانات کے تحت بہت کچھ ادبی مواد پڑھنے کو مل رہا ہے۔ اداریہ، مضامین، انٹرویو، خود نوشت، شاعری، افسانے، مطالعہ کے تحت جو مشمولات ہیں وہ قابل مطالعہ اور قارئین کو ادبی بصیرت کے ساتھ مسرت بھی عطا کرتے ہیں۔ 82 صفحات کا شمارہ اپنے دامن میں تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی، خاکہ، انشائیہ، انٹرویو وغیرہ لیے ہوتے ہیں۔ اس رسالے کو ہر اردو خاندان میں منگوانا ناگزیر ہے تاکہ عمدہ ادبی تربیت ہو سکے۔ اگر اردو والے ادبی رسائل خرید کر نا پڑھیں گے تو کون پڑھے گا۔ اردو والوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ رسالہ کو گھر پر منگوائیں تاکہ رسالے کے ساتھ اردو کی خدمت ہو سکے۔ سب رس ادبی رسائل میں اپنے معیار و کمیت و کیفیت کے لحاظ سے شناخت بنا چکا ہے اور تحقیق و تنقید میں حوالے کے طور پر پہچانا جاتا ہے ایسے رسالوں کی مانگ زیادہ ہونا چاہیے اس رسالے میں حیدرآباد دکن کے قلم کاروں کو جگہ دی جائے تو نوازش ہوگی۔

ناظم علی۔ نظام آباد

یوسف نون

Ph.D. Scholar, Bahauddin Zakariya University, Multan, Pakistan

علی احمد فاطمی

Urdu Department, University of Allahabad, Allahabad

اسود گوہر

Plot No.66 Near Hashmi Masjid
Bismillah Colony
Aurangabad. 431001(M.S)

مشتاق احمد وانی

Asst. Prof. Dept of Urdu
Baba Ghulam Shah Badshah University
Rajouri J& K Lane-3 H.No. 7 Firdous
Abaad, Sunjawn, Jamuu Tawi 180011

اسداللہ شریف

No1416,Tahira Mansion
Dr Rajkumar Road,Sathgalli Layout
Mysore-570029

رحمٰن جامی

"Al-Hira" 12-2-830/7/3, Hill Colony,
Qari Sahib Lane, Mehdipatnam
Hyderabad - 500 028

مسلم نواز

C/o. Baitul Kasim, # 12-3-H/1,
Patwar Bagan Lane, Kolkata - 9

احسن رضوی

B-1/4, Balda Road Colony, Nishatganj,
Lucknow - 226 007

بی ایس جین جوہر

Portapur, Delhi Road, Meerut - 250 103

محمد شاہد پٹھان

582, O.T.C. Scheme,Udaipur - 313 001

مصداق اعظمی

Jawma, Mejwa, Phoolpur, Azamgarh, Uttar Pradesh - 276 304

سریواستورند

R-16, Sector -XI, Noida - 201 301

مسعود جعفری

8-1-43/1/A/5, P.O. Shaikpet,
Hyderabad - 500 008 (T.S.)

معین الدین عثمانی

24, Shahu Nagar, Jalgaon - 425 001

ساحر لدھیانوی (پیدائش 8/مارچ 1921ء)

Regd. No. RNP/HD/970/2018-20 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.81, Issue-03 March, 2019 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

سیاست

حیدرآبادی دور،
ثقافت اور طرز زندگی کا
مصدقہ عکاس!

سیاست آج ملک کے مؤقر اردو روزناموں میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد اخبار ہے۔ سیاست نے دیگر ممالک میں بسے ہوئے اردو قارئین کی روز مرہ کی زندگی میں اپنا ایک نمایاں مقام بنایا ہے۔ اخبار کی روزانہ بذریعہ طیارہ مشرق وسطیٰ، یو کے، یو ایس اے اور کینڈا ترسیل عمل میں آتی ہے۔

...اور وہ حیدرآبادی حضرات جو اپنے وطن سے دور ہیں، سیاست کے مطالعہ کے بعد خود کو حیدرآباد میں ہی محسوس کرتے ہیں۔ سیاست کی ویب سائیٹ کے ذریعہ انہیں حیدرآبادی ثقافت، مناظر، ذائقہ اور گنگا جمنی تہذیب اور روایات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسی ویب سائیٹ جسے 107 ممالک سے روزانہ چار لاکھ ہٹس موصول ہوتے ہیں۔

سیاست نے اردو زبان سے واقف قارئین کے دلوں تک رسائی حاصل کر کے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے۔

روزنامہ سیاست حیدرآباد

The Siasat Daily

J.N. Road, Abids, Hyderabad - 500 001 (A.P.)
Tel : 24744180, 24603666, 24744109, 24744114
Fax : Editorial : 040-24603188, Advertisement : 24610379
Website : www.siasat.com, E-mail : siasat.daily@yahoo.com

حیدرآباد کا دوسرا نام سیاست

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Taahaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (T.S.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469